سُونی سُونی گلیاں ہیں اُجڑی اُجڑی چوپالیں
جیسے کوئی آدم خور، پھر گیا ہو گاؤں میں

جب کسان، کھیتوں پر دوپہریں سجاتے ہیں
لوٹتے ہیں سگ زادے، کیکروں کی چھاؤں میں

تم ہمارے بھائی ہو — بس ذرا سی دوری ہے
ہم فصیل کے باہر، تم محل سراؤں میں

خون رستے گتا ہے، ان کے دامنوں سے بھی
زخم چھپ نہیں سکتے، ریشمی ردائوں میں

دوستی کے پردے میں، دشمنی ہوئی اتنی
رہ گئے فقط دشمن، اپنے آشناؤں میں

امن کا خدا حافظ — جب کہ نخلِ زیتوں کا
شاخ شاخ جلتا ہے، بھوکی فاختاؤں میں

ایک بے گنہ کا خون، عشم جگا گیا کتنے!
بٹ گیا ہے اِک بیٹا، بے شمار ماؤں میں

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

خاک سے جُدا ہو کر، اپنا وزن کھو بیٹھا
آدمی معلق سا رہ گیا خلاؤں میں

اب ندیمؔ منزل کو ریزہ ریزہ چُنتا ہے
گھر گیا تھا بے چارہ، کتنے رہ نماؤں میں

جنوری ۱۹۷۶ء

○

ہم کبھی عشق کو وحشت نہیں بننے دیتے
دل کی تہذیب کو تہمت نہیں بننے دیتے

لب ہی لب ہے، تو کبھی — اور کبھی چشم ہی چشم
نقش تیرے، تری صورت نہیں بننے دیتے

یہ ستارے جو چمکتے ہیں پسِ ابرِ سیہ
تیرے غم کو مری عادت نہیں بننے دیتے

تُو کبھی رات، کبھی دن، کبھی ظلمت، کبھی نُور
تیرے جلوے، تجھے وحدت نہیں بننے دیتے

اُن کی جنّت بھی کوئی دشتِ بلا ہی ہوگی
زندہ رہنے کو جو لذّت نہیں بننے دیتے

ہاں مسرّت تو ہے برحق، مگر افکارِ حیات
کوئی پیرایۂ راحت نہیں بننے دیتے

فکر، فن کے لیے لازم — مگر اچھے شاعر
اپنے فن کو کبھی حکمت نہیں بننے دیتے

وہ محبت کا تعلّق ہو کہ نفرت کا ندیمؔ
رابطے، زیست کو خلوت نہیں بننے دیتے

فروری ۱۹۷۹ء

ہم سفر

چاند کی سمت جب اُڑتا ہوں
تو ہر بار عجب حادثہ ہو جاتا ہے
وہ جو مٹی کا دیا جلتا ہے میرے گھر میں
اپنی لَو سر پہ رکھے، آتا ہے
اور کہتا ہے:
تیرے ساتھ چلوں گا کہ سفر دور کا ہے
اور تو راہ سے بھٹکا
تو میں بے آسرا رہ جاؤں گا!

ہنستے کھیلتے

خشک پتّے
ہوا کے ہمجولی
کودتے، پھاندتے، گنگناتے ہوئے
دامنِ موجِ صبا تھامے
مملکتِ زندگی کی طے کر کے
سرحدِ نیستی پہ جا پہنچے

چاند

اسے میں نے دیکھا
تو سوچا
کہ اب چاند نے
اپنے سورج سے
لَو مانگنا چھوڑ دی ہے!

جنوری ۱۹۷۰ء

منفیّت کا منشور

چلو کچھ اور سوچیں
ہم نے اب تک جو بھی سوچا ہے
وہ صدیوں کی پرانی سوچ ہے
اب عہد جو ہر ہے
یہ وہ لمحہ ہے
جس کے شہپروں پر بیٹھ کر
ہم کو زمیں سے اپنا ناتا توڑنا اور آسماں سے جوڑنا ہے

چلو کچھ اور سوچیں
اب یہ دنیا
اور انساں
اور اس کے دُکھ
پرانے، کرم خوردہ، بُھربُھرے، بد رنگ، بے لذت فسانے ہیں

چلو کچھ اور سوچیں
اور محبت کی بساطیں تہ کریں
اور حسن کی قدریں بدل ڈالیں
چمکتی دھوپ پر
اور چاندنی راتوں پہ لعنت بھیج کر
پھولوں پہ تھوکیں
ندیوں کو پتھروں سے پاٹ دیں
رشتوں کو کاٹیں

رابطوں کو روند ڈالیں
سولیاں گاڑیں

چلو کچھ اور سوچیں
لفظ سے مفہوم کی دولت اچک لیں
اور اسے پتھر بنا ڈالیں
زبانیں نوکِ خنجر کی طرح سینوں میں گاڑیں
نغمگی کو چیخ میں بدلیں
سمندر خشکیوں پر کھینچ لائیں
وادیوں میں دلدلیں بھر دیں

چلو کچھ اور سوچیں
اب یہی سوچیں
کہ جو کچھ آدمی نے آج تک سوچا ہے

وہ سب کفر ہے
اور حق فقط یہ ہے
کہ جو کچھ ہے
نہیں ہے
کچھ نہیں ہے
واہمہ ہے
خواب ہے
اور خواب سوچوں کی قدامت کا نتیجہ ہیں!

جنوری ۱۹۷۶ء

فشار

پھول جب کھل چکا تو کہنے لگا:

اب مرا حسن میرے بس میں نہیں
اب میں اپنی بھی دسترس میں نہیں

جنوری ۱۹۷۶ء

قبر پہ پھول

اب کے بارش جو ہوئی
میں نے یہ دیکھا
کہ سرِ راہ جو اک قبر تھی
(شاید کسی دیوانے کی)
اس پہ اک پھول کھلا ہے
جو ہواؤں کے تھپیڑوں سے تڑپتا ہے
تو پاتال سے ہنسنے کی صدا آتی ہے

جنوری ۱۹۷۶ء

کون گیا کون آیا

نہ جانے سیڑھیوں سے کون اُترا جا رہا ہے!
اس کی ہر ہر چاپ میں صدیوں کی دُوری ہے!
مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے عالمِ سکرات میں جو سانس آئی تھی
وہ واپس جا رہی ہے!

جنوری ۱۹۷۶ء

پت جھڑ کی تنہائی

عجب خال و خد تھے!
ستارہ سی آنکھیں
شرارہ سے لب
اور صحیفہ سا چہرہ!
بدن ـــ اک چمن
چال ـــ بادِ صبا
بات ـ ـ خوشبو
محبت ـــ بہت گہری آسودگی فصلِ گل کی!
مگر آج وہ خال و خد دیکھ کر سوچتا ہوں
کہ میری بصارت کو پت جھڑ کی تنہائی نے کھا لیا ہے

جنوری ۱۹۷۶ء

خواب

چاندنی نے سنگِ شب جب زرد کر ڈالا ـ تو میں
ایک ایسے شہر سے گزرا ـ جہاں
صرف دیواریں نمایاں تھیں
چھتیں معدوم تھیں
اور گلیوں میں فقط سائے رواں تھے
جسم غائب تھے!

فروری ۱۹۷۶ء

رہنما

رات جنگل میں آئی
تو چیتے کی آنکھوں نے
دو مشعلیں یوں جلائیں
کہ میں راستے سے بھٹکنے کی عیاشیاں بھول بیٹھا!

فروری ۶ - ۱۹ء

○

جمالِ فن کا، ترے اور میرے گھر میں رہا
کمالِ فن کا مگر دستِ کوزہ گر میں رہا!

میں تجھ کو پا کے، تجھی کو صدائیں دیتا ہوں
تُو میرے دل میں اُتر کر بھی کیوں سفر میں رہا

جسے بھی دیکھوں، ترے حسن کی لپیٹ میں ہے
کہ جیسے سارا جہاں تیری رہگزر میں رہا

ترے وصال — تری بارشِ جمال میں بھی
تری جدائی کا منظر مری نظر میں رہا

رہے نہ دل میں اڑانوں کے حوصلے باقی
یہ اور بات کہ رعشہ سا بال و پر میں رہا

یہ انکشاف اگر کفر ہے، تو کیسا کہیے
فرشتے عرش پہ، لیکن خدا بشر میں رہا

فروری ۱۹۷۶ء

ترقی یافتہ

بستی بستی شور اُٹھتا ہے:
"مہنگائی! مہنگائی!"

مغرب والے
سونے کے انبار پہ چڑھ کر
کتنی اُداس آواز میں فرماتے ہیں:
"دیکھو!
مشرق کو خود اس کی ترقی راس نہ آئی!"

فروری ۱۹۷۶ء

○

اب ترے رُخ پر محبّت کی شفق پھولی، تو کیا
حسن برحق ہے اگر جب بجھ چکا ہو جی، تو کیا

جب ترا کہنا ہے تو تقدیر کا محکوم ہے
تو نے نفرت کی تو کیا، تُو نے محبّت کی تو کیا

اب کہاں سے لاؤں وہ آنکھیں جو لذّت یاب ہوں
دستِ باراں نے مرے در پر جو دستک دی، تو کیا

ہجر کی شب، اس تصوّر سے کسے تسکین ہو
سامنے رہتی ہے تیری شکل پیاری سی، تو کیا

جذب ہو جائیں گے خاکِ بے حسی میں سات رنگ
آنسوؤں کے ساتھ ٹپکا ہے اگر خوں بھی، تو کیا

دھوپ، کرنوں میں پرو لے جائے گی ساری نمی
رات بھر پھولوں نے دستِ شب سے شبنم پی، تو کیا

اب تو بیلا بوں سے جل تھل ہو گئیں آبادیاں
اب مرے کھیتوں کی لاشوں پر گھٹا برسی، تو کیا

جو رجس گھر میں پلیں، اس گھر کو کیسے بخش دیں
لُوٹنے آئے ہیں ہم لوگوں کو اپنے ہی، تو کیا

ہم نہیں ہوں گے تو پھر کس کام کی تحسینِ شعر
روشنی اک روز ان لفظوں سے پھوٹے گی، تو کیا

دُور کی آہٹ تو آ پہنچی ہے اب سر پہ ندیم
آگہی نے مدّتوں کے بعد کروٹ لی، تو کیا

فروری ۱۹۷۰ء

جبر

ہوا کے ڈر سے گلوں نے قبائیں سی لی ہیں
اگر نمود ہو شبنم کی، کس امید پہ ہو
کہاں گئے وہ گلابی ہتھیلیوں سے برگ
کہاں گئیں وہ جبینیں، کہاں گئے وہ لب
جو دھوپ شاخ سے چھن چھن کر کرن کرن ٹپکی
کسے لگائے گی سینے سے، کس کو چومے گی
مسافروں نے اگر اس جگہ قیام کیا
تو میزبان کی آمد کے انتظار کے بعد
اٹھیں گے اور کس صحرا میں جا کے دم لیں گے
کہ ان کو دشت سے جو نکہتیں بلاتی رہیں
وہ اب گلوں کی قباؤں میں سر بزانو ہیں

مارچ ۱۹۷۶ء

تھکن کا ایک لمحہ

سڑک کس قدر سخت، سفاک اور کھردری ہے
وہ جوتوں کے چمڑے
نئے ٹائروں کے ربر
رہروؤں کے ارادوں کو
یوں چاٹ جاتی ہے
جیسے کوئی اژدہا ہے
جو صدیوں کا بھوکا ہے
اور زندگی کو نگلتا چلا جا رہا ہے!

مئی ۱۹۷۶ء

○

آئے، کوئی انقلاب آئے
دل پر نہ مگر حجاب آئے

بیلپی کے قفس کو توڑتے ہی
موتی میں بلا کی آب آئے

افسوں کی کتابِ زندگی میں
کیوں کرب کے اتنے باب آئے

جب میرا سوال ہے زمیں سے
افلاک سے کیوں جواب آئے

ذرّات کا ذکر ہو رہا ہے
کیوں بیچ میں آفتاب آئے

قرنوں پہ محیط علم تیرا
لمحوں کا مجھے حساب آئے

سیلابِ خود آگہی جب اُمڈا
کہسار بھی زیرِ آب آئے

زنداں سے تو میں نمٹ چکا ہوں
اب اور کوئی عذاب آئے

ہر روز نیا جنم لیا ہے
مجھ پر تو کئی شباب آئے

جو شاخ تنے کی نفی کر دے
اس شاخ پہ کیا گلاب آئے

مئی ۱۹۷۶ء

قریۂ محبت

بہت شدید تشنج میں مبتلا لوگو!
یہیں قریبِ محبت کا ایک قریہ ہے

یہاں دھوئیں نے مناظر چھپا رکھے ہیں، مگر
افق بقا کا وہاں سے دکھائی دیتا ہے

یہاں تو اپنی صدا کان میں نہیں پڑتی
وہاں خدا کا تنفس سنائی دیتا ہے

سنہ ۱۹۰۶ء

○

یوں تو میں دشت پہ بھی پرتوِ گلشن دیکھوں
سایۂ گل میں مگر سانپ کا مسکن دیکھوں

اب تو یہ دستِ تہی کاٹنا جائز ٹھہرا
مدتوں سے کئی پھیلے ہوئے دامن دیکھوں

مر گئے تشنہ دہن، جل گئے کھیتوں کے بدن
اب تو برسات کے امکان کو روشن دیکھوں

اتنا چمکا مجھے افشائے حقیقت کا پڑا
آسمانوں میں بھی روزن، پسِ روزن دیکھوں

مجھ پہ ہے شیخ کی تکریم تو لازم لیکن
اسے نزدیک سے دیکھوں تو برہمن دیکھوں

کبھی کہسار میں کرتا تھا میں معدن کی تلاش
اب زمینوں میں بھی بیسنوں میں بھی آہن دیکھوں

جون ۱۹۷۶ء

"روح و بدن کے خم و پیچ"

کتنا شفاف ہے بدن تیرا
کل جو تو میرے پاس سے گزری
میں نے دیکھا، کہ تیرے چہرے پر
جھیل کا سا سکون چھایا ہے
اور ترے دل پہ جب نظر ڈالی
میں نے وہ حشر سا بپا دیکھا
جس طرح زلزلہ سا آیا ہے

جون ۱۹۷۶ء

○

وہ جو اک عمر سے مصروفِ عبادات ہیں تھے
آنکھ کھولی تو ابھی عرصۂ ظلمات میں تھے

صرف آفات نہ تھیں ذاتِ الٰہی کا ثبوت
پھول بھی دشت میں تھے، حشر بھی جذبات میں تھے

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا، نہ منشائے خدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں تھے

میں نے کی حدِ نظر پار، تو یہ راز کھلا!
آسماں تھے تو فقط میرے خیالات میں تھے

میرے دل پر تو گریں آبلے بن کر بوندیں
کون سی یاد کے صحرا تھے جو برسات میں تھے

اس سبب سے بھی تو میں قابلِ نفرت ٹھہرا
جتنے جوہر تھے محبت کے مری ذات میں تھے

صرف شیطاں ہی نہ تھا منکرِ تکریمِ ندیم
عرش پر جتنے فرشتے تھے، مری گھات میں تھے

جولائی ۱۹۷۷ء

نئی تعبیر

غم کو تسخیر کریں، درد کو زنجیر کریں
آؤ حالات کی کچھ اور بھی تعبیر کریں

جب کبھی اہلِ قلم صدق کی تفسیر کریں
وہ جو تکفیر پہ مامور ہیں، تکفیر کریں

اے خدا، کفر ہمارا ہے بس اتنا سا، کہ ہم
تیری تکریم تو انسان کی توقیر کریں

جن کے اعمال کا شہر محورِ آشوبِ حیات
آج کل فلسفۂ خیر پہ تقریر کریں

کیوں دکھائیں کسی بے کس کو اسی کی تصویر
ایک دلگیر کو کیوں اور بھی دلگیر کریں

اگر انسان فرشتے نہیں، جنات نہیں
مرمریں قصر ہواؤں میں نہ تعمیر کریں

دل اگر خون ہُوا ہے تو یہ بیکار نہ جائے
اپنے اس عہد کا منشور ہی تحریر کریں

جولائی ۱۹۷۶ء

○

اہلِ ثروت پہ خدا نے مجھے سبقت دے دی
اس کی رحمت نے قلم کی مجھے دولت دے دی

نجمہ زن حسن کو دیکھا افقِ فردا پر
میں نے فن میں اِسی اک خواب کو وسعت دے دی

وہ کبھی مہر، کبھی ماہ، کبھی دن، کبھی رات
ذہنِ کثرت کو مرے ذوق نے وحدت دے دی

اپنے اللہ سے شکوے کا محل ہو تو کروں
غم دیے، ساتھ ہی غم سہنے کی راحت دے دی

اُس کا احسان کہ جو نفرت کا ہدف ہیں کب سے
مجھ کو اُن خاک نشینوں کی محبت دے دی

مجھ سے کافر پہ فرشتے کا اترنا ہی غضب
پھر ستم یہ، اسے انسان کی سیرت دے دی

آئنہ دیکھتے ہی، میں نے پلٹ کر دیکھا
عشق نے جیسے مجھے بھی تری صورت دے دی

اگست ۱۹۷۶ء

بادِ بہار بھی چلتی ہے، آرے کی طرح
پھولوں سے آنچ آتی ہے، شعلے کی طرح

زندہ ہوں، یا کوئی ٹھکانا ڈھونڈتا ہوں
دستِ شجر سے چھوٹے ہُوئے پتّے کی طرح

کتنا خوش رُو، اور کتنا زہریلا تھا
مجھ کو تو وہ شخص لگا ہیرے کی طرح

اُس کی یاد سکوں بھی اور بے چینی بھی
ماں کی گود میں روتے ہُوئے بچے کی طرح

جانے کرۂ ارض پہ، یا مریخ پہ ہوں
چاند لگے چنگاری کے نقطے کی طرح

نئے نئے اوہام، قدیم ایمانوں پر
پھیل رہے ہیں، مکڑی کے جالے کی طرح

اک اک رہبر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے
پنجوں کے بل کھڑے ہُوئے بچے کی طرح

یہ شاید سچ کہنے کا ہنگام نہ تھا
اب گھبرایا بیٹھا ہوں، جھوٹے کی طرح

باطل سے ٹکرا کر جب حق پلٹا ہے
سینے پر سے گزرا ہے، پہیے کی طرح

شاید اُس پہ صبح کا پرتو پڑتا ہو
رات کا ماتھا روشن ہے، تارے کی طرح

گردش کے آئینے میں بیٹھا ہے حسنِ
حدِ نظر تک تنے ہوئے حلقے کی طرح

میری خاک، بصیرت کی اکسیر بنی
مجھ کو وقت نے پیسا تھا، سُرمے کی طرح

میرے فن کا کام حیات افروزی ہے
صحراؤں کی وسعت میں لالے کی طرح

اگست ۱۹۷۶ء

○

سر سے در دُور نہیں، سنگ سے سر دور نہیں
صاف ظاہر ہے کہ پایانِ سفر دور نہیں

دل میں اُتری چلی جاتی ہے ستارے کی اَنی
ہونہ ہو، اب شبِ وعدہ کی سحر دور نہیں

کتنا خوش ہوں در و دیوار کی ویرانی سے
اس کا مطلب ہے یہاں سے مرا گھر دور نہیں

ہجر اچھا، مگر اس کی کوئی حد ہوتی ہے
تم دعا رُوٹھ کے مانگو تو اثر دور نہیں

نوعِ انساں کی محبت میں سہولت ہے ندیمؔ
دور رہتا ہے خدا، اور بشر دور نہیں

اگست ۱۹۷۶ء

انفصال

دوستو!
تم تو کندھوں سے اُوپر نظر ہی نہیں آ رہے ہو
چلو
اپنے چہرے ندامت کی الماریوں سے نکالو
انہیں جھاڑ کر گردنوں پہ رکھو
تم ادھورے نہیں ہو تو پُورے دکھائی تو دو

ستمبر ۱۹۷۷ء

گناہ و ثواب

مہربان رات نے
اپنی آغوش میں
کتنے ترسے ہوئے بے گناہوں کو کھینچا
دلاسہ دیا
اور انہیں اس طرح کے گناہوں کی ترغیب دی
جس طرح کے گناہوں سے میلادِ آدم ہُوا تھا

ستمبر ۱۹۷۶ء

سخن ناشناس

میں جب شعر کہتا ہوں
دیوارِ فردا پہ
میرا قلم
خون کے رنگ میں
پھول سے لفظ لکھتا ہے
لیکن کوئی یہ زباں پڑھنے والا نہیں!

ستمبر ۱۹۶۶ء

آنے والے منظروں کی نذر

سنہرے — ڈوبتے سورج نے
قرطاسِ فلک پر
اِک عجب تصویر کھینچی ہے!
مگر تصویر میں جو رنگ بھرتے ہیں شعاعوں نے
وہ کہتے ہیں:
انھیں الفاظ میں محفوظ کر کے
آنے والے منظروں کی نذر کرنا
انتہائے فن پرستی بھی ہے

تلاقی بھی
اور فن کی دیانت بھی
عبادت بھی

جو بادل دور ہیں
لاکھوں کروڑوں کوس پر ہیں
اور جو نزدیک ہیں
ان کو اگر چھو لو
تو پوریں رنگ جائیں سات رنگوں میں!

قریب و دور میں جو فاصلہ ہے
اس میں گہرا اور نیلا اور چمکیلا فلک یوں پُرسکوں ہے
جیسے تا حدِ نظر پھیلے سمندر پر سے جب کشتی گزر جائے
تو وہ آسودگی کی سانس لیتا ہے!

جو بادل دُور ہیں
اب تک طلائی تھے مگر اب زرد ہیں
اور جو نزدیک ہیں
اب تک گلابی تھے مگر اب شعلہ وش ہیں
اور نیلا آسماں اب سبز ہے
اب سرمئی ہے
اب فقط لاانتہائی کے خلا کا ایک صحرا ہے
جو بادل زرد تھے
اب گھلتے جاتے ہیں
جو بادل شعلہ وش تھے
بجھتے جاتے ہیں
اِدھر مشرق سے جو سیلابِ شب اُمڈا ہے
سناٹے کی لہروں کی زبانوں سے
گئے خورشید کی تسلیمِ فن کو چاٹ لیتا ہے

مگر طغیانِ تاریکی کے اس آشوب میں
پہلا ستارہ آسماں پر جب چمکتا ہے
تو وہ اپنی ہنسی پر ضبط کرتا ——
بزمِ سرگوشی میں کہتا ہے
کہ سورج ڈوبنا کب ہے!

ستمبر ۱۹۷۶ء

میـــلاد

بہت زرد پتوں کے جھرمٹ میں
اک سبز پتہ اُگا
اور شجر
انکشافِ توانائی کے جوش میں تن گیا
ایک جھونکا جو گزرا
تو لے کر اسے اپنی آغوش میں
چھومنے، گنگنانے لگا

ستمبر ۱۹۷۶ء

شبِ معصوم

تیرے رخسار پر یہ جو اچٹا ہُوا ایک تِل ہے
جوازِ شبِ تار ہے
اور یہ شب
چار جانب سے اُمڈی ہُوئی روشنی اور شفق میں گھری
اتنی معصوم لگتی ہے
جیسے یہ آسماں کے سمندر میں چاند اک جزیرہ بنا
اپنے انجام سے بے خبر
تیرتا ہے

ستمبر ۱۹۸۶ء

مہذّب

مجھے کل مرا ایک ساتھی ملا
جس نے یہ راز کھولا
کہ ــ "اب جذبہ و شوق کی وحشتوں کے زمانے گئے!"

پھر وہ آہستہ آہستہ ــ چاروں طرف دیکھتا
مجھ سے کہنے لگا :
"اب بساطِ محبت لپیٹو
جہاں سے بھی مل جائے دولت ــ سمیٹو
غرض کچھ تو تہذیب سیکھو!"

ستمبر ۱۹۷۶ء

○

بکھر تو جاؤں گا لیکن اجڑ نہ جاؤں گا میں
حیات کھو کے بھی کائنات پاؤں گا میں

جو گھر کھنڈر ہی کھنڈر ہیں انھیں بساؤں گا میں
جہاں دیے نہیں جلتے، وہیے جلاؤں گا میں

بگڑ چکی ہیں بہت عادتیں عناصر کی!
گھٹائیں بن کے سرِ ریگزار چھاؤں گا میں

تو میرے دل میں اُترنے کا حوصلہ تو رکھا
یہاں سے عرش کا منظر تجھے دکھاؤں گا میں

گزر ہُوا جو کبھی جلوہ زارِ سینا سے
تو طُور پر کس انسان کو بلاؤں گا میں

چلن خدا کا، مجھ انساں سے نبھ نہ پائے گا
اسے مٹاؤں گا کیسے، جسے بناؤں گا میں

نومبر ۱۹۷۶ء

○

جو لوگ دشمنِ جاں تھے، وہی سہارے تھے
منافعے تھے محبت میں، نہ خسارے تھے

یہ عشق تھا، کہ فقط عشق جس کا مسلک تھا
اس امتحان میں سجدے نہ استخارے تھے

جو لوگ ترکِ طلب پر بضد تھے، ان کے لیے
جہاں رکے تھے سفینے، وہیں کنارے تھے

خود اپنا آپ گنوا کر جنھیں خدا نہ ملا
وہ تیرگی کے نہیں، روشنی کے مارے تھے

حضورِ شاہ بس اتنا ہی عرض کرنا ہے
جو اختیار تمھارے تھے حق ہمارے تھے

یہ اور بات، بہاریں گریز پا نکلیں
گلوں کے ہم نے تو صدقے بہت اتارے تھے

خدا کرے کہ تری عمر میں گنے جائیں
وہ دن جو ہم نے ترے ہجر میں گزارے تھے

اب اذن ہو تو تری زلف میں پرو دیں پھول
کہ آسماں کے ستارے تو استعارے تھے

قریب آئے تو ہر گل تھا حسن نہ زنبور
ندیمؔ دور کے منظر تو پیارے پیارے تھے

دسمبر ۱۹۷۶ء

آشوب

خدا کو بلاؤ
کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے

میں مٹی کا انساں ہوں
میں آسماں کا فرشتہ نہیں
اس لیے معتبر بھی نہیں ہوں
خدا اپنی آنکھوں سے دیکھے
کہ وہ سر جو صدیوں کے سجدوں سے زخمی ہیں
اب آسماں کی طرف اٹھ رہے ہیں

وہ دیکھے
کہ آنکھوں میں اب حسن دریافت کرنے کی ساری چمک بجھ چکی ہے
کھنڈر کے دریچوں سے آخر کھنڈر کے سوا کیا نظر آسکے گا!

وہ دیکھے
کہ جو لب فقط ذکرِ رب یا محبت کے اظہار یا پھر غنا کے لیے
وا ہوئے
آج اوّل تو کھلتے نہیں
اور کھلتے ہیں جب، تو شرارے اُگلتے ہیں

وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے
کہ سینے — دفینے جو تھے کبریائی کے اسرار کے
اب وہاں وہم کے اژدہے
کینچلی پر بدلتے ہوئے کینچلی
ہسہساتے ہیں، پھنکارتے ہیں

حسیں جسم، روحوں کے تاریک پنجر میں
حدِ نظر سے پرے اک دیے کی طرف بڑھ رہے ہیں
مگر ہر قدم پر یہ حدِ نظر اک قدم اور ہٹتی چلی جا رہی ہے

جو انسان کے ذہن کی شاہراہیں تھیں
ان پر یقینوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہیں

جو اس کے تصور کے فردوس تھے
ریزہ ریزہ پڑے ہیں

جو اس کی پرستش کے معیار تھے
نوکِ خنجر کی مانند ان راستوں پر گڑے ہیں
جو یادش بخیر اک زمانے میں سیدھی خدا کی طرف جا رہی تھیں
مگر اب فقط دائروں میں بھٹکتی ہوئی رہ گئی ہیں

خدا کو بلاؤ
کہ اس کا یہ شہکارِ فن
اپنے محور سے ہٹنے لگا ہے
وہ چھوٹوں بڑوں اور نیکوں بدوں کے قبیلوں میں بٹنے لگا ہے
وہ جو عرش تک پھیل جانے کے گر سوچتا تھا
سکڑنے لگا ہے، سمٹنے لگا ہے
وہ آشوب، جو اس نے اپنی ذکاوت سے پیدا کیا تھا
اسی سے نمٹنے لگا ہے

جنوری ۱۹۷۷ء

○

مر کر جنت میں گو گئے ھم
فردوسِ حیات کھو گئے ھم

آنکھوں میں کٹی تھی رات ساری
سورج نکلا تو سو گئے ھم

گو ہم کو خدا نہ ہاتھ آیا
امکان کے بیج بو گئے ھم

تھا ابرِ کرم پہ طنز مقصود
رو کر صحرا بھگو گئے ھم

اپنی پہچان کے سفر پر
نکلے تو کسی کے ہو گئے ہم

یوں ہم نے لیا فنا کا بدلہ
غزلوں میں بقا سمو گئے ہم

جنو ـ ۱۹۷۷ء

اضافی

کشیدہ قامتی سرو پر نہیں موقوف
خمیدہ پشت درختوں پہ بھی، سحر کے قریب
طیور، نغمہ سرائی کی دُھن میں اتریں گے!

جنوری ۱۹۷۵ء

عقل اور وجدان

ایسی دنیا سے ہمیں کوئی توقع کیا ہو
جس میں وجدان پہ ہو عقل کی ضد کا الزام
عقل انسان کے پیکر میں تو محبوس نہیں
اور وجدان ہے اس عقل کی پرواز کا نام
سوچتے سوچتے آجاتے ہیں ایسے پل بھی
جب بگڑ جاتا ہے یہ عالم اشیا کا نظام
اور ہم لوگ خلا تا بہ خلا دیکھتے ہیں
جس طرف دیکھتے ہیں صرف خدا دیکھتے ہیں

جنوری ۱۹۷۷ء

○

(نذر اقبال)

جانے یہ محبت کیا شے تھی، تڑپا بھی گئی، تھپکا بھی گئی
ایک آدھ افق دھندلا بھی گئی، آفاق نئے چمکا بھی گئی

کیوں کہتے ہو قیس اکیلا تھا جب قریۂ ناپرساں سے گیا
ساتھ اس کے ردائے لیلیٰ کی خوشبو بھی اور ہوا بھی گئی

جدت سے مجھے انکار نہیں یاروں سے مگر یہ پوچھنا ہے
یہ کون سا ہے معیارِ وفا، امید گئی تو وفا بھی گئی

یہ صدی بظاہر بری سہی، یہ صدی کچھ ایسی بری نہ تھی
گو اس نے بجھائے چراغ کئی، قندیلیں نئی سلگا بھی گئی

کچھ خال و خد پہچانو تو، یہ لو کا تھپیڑا ہی نہ ہو
اک موج ہوائے گلشن کی، کہتے ہیں سوئے صحرا بھی گئی

رحمت پہ ندیمؔ نہ طنز کرو، کھیتوں کو خشک ہی رہنے دو
اب سوئے فلک کیا دیکھتے ہو، بدلی تو برس برسا بھی گئی

جنوری ۱۹۷۷ء

منطقۂ داخلی

شعاعیں
جو جاتے ہوئے اک تھکے ہارے سورج نے
چنگاریوں کی طرح چُن کے دامن میں بھر لی تھیں
اب برف کے نرم گالوں کے فرغل پہن کر پلٹ آئی ہیں
اب دہکتے ہوئے فرش پر پاؤں ٹھٹھرے ہُوئے رینگتے ہیں !
ہوائیں
جو اُوبن کے پوری صدی تک چلی اور چلی تھیں
اپاہج بنی، گر پڑی ہیں !
زمیں کی زباں گنگ ہے
آنکھ پتھرائی ہے
ہونٹ نیلے ہیں

بازو لٹکتے ہُوئے ڈھیلے ڈھیلے ہیں
چاروں طرف اک بھیانک سفیدی کا ویرانہ ہے
جس میں انسان چیخے
تو الفاظ اولوں کی مانند جم جائیں !

اب زندگی کے پگھلنے کا امکان
اِک ایسے سورج سے وابستہ ہے
جو کہیں سے بھی آئے
وہ مشرق سے نکلے کہ مغرب سے ابھرے
وہ افلاک سے گر پڑے
یا زمیں سے نکل آئے --
بس ایک سورج ہو
جو انجمادِ مسلسل کا دشمن ہو
اور ڈوبنا جس کو آتا نہ ہو

جنوری ۱۹۷۷ء

ذرا آسماں تک

فلک پہ آئینے انساں سجانے آئے ہیں
کسی کی پردہ دری کے زمانے آئے ہیں
ہم آپ اپنا مقدّر بنانے آئے ہیں
ہم آسماں کو زمیں سے ملانے آئے ہیں
ہمارے پیشِ نظر تھی خدا کی دربدری
سفر میں یوں تو ہزاروں ٹھکانے آئے ہیں
ہماری زندہ دلی دیکھنے کے لائق ہے
لہو لہو ہیں مگر سینہ تانے آئے ہیں
فرشتے راستہ دیں، اور یہ گماں نہ کریں
ہم اپنے روٹھے خدا کو منانے آئے ہیں

بہشت دیکھنا ہے جس سے ہم نے ہجرت کی
نہ حق جتانے، نہ جھگڑا چکانے آئے ہیں
شجر اُگا کے یہ کہنا، شجر سے دور رہو
ہم اس تضاد کے کچھ بھید پانے آئے ہیں
زمیں، روزِ ازل کی طرح اُجڑ جائے
ہم اپنے فن کی اگر داد پانے آئے ہیں

جنوری ۱۹۷۷ء

○

یہ برزخ ہے یا قیامت کی گھڑی ہے
جسے دیکھو، اسے اپنی پڑی ہے

اگر ہیں ذہنِ یزداں کو کھلوں پھول
تو وہ اس پھول کی اک پنکھڑی ہے

وفا کے ہیں عجب معیار میرے
محبت وقت سے کتنی بڑی ہے

ہے میرے سامنے منظر انوکھا
خدا ہے اور ساون کی جھڑی ہے

گھڑی پہلی محبت کی عجب تھی
ابھی تک یاد کے در پر کھڑی ہے

عجب گلزار ہے تہذیبِ انساں
کہ اس کے وسط میں سولی گڑی ہے

لاہور ۱۹۷۷ء

نہ وہ سن ہے فرصتِ عشق کا، نہ وہ دن ہیں کشفِ جمال کے
مگر اب بھی دل کو جواں رکھیں وہی شعبدے خد و خال کے

یہ جو گردِ بادِ حیات ہے، کوئی اس کی زد سے بچا نہیں
مگر آج تک تری یاد کو میں رکھوں سنبھال سنبھال کے

میں امین و قدر شناس تھا، مجھے سانس سانس کا پاس تھا
یہ جبیں پہ ہیں جو لکھے ہوئے، یہ حساب ہیں مہ و سال کے

وہ کبھی شفق کا فسوں کہیں، کبھی گل کہیں، کبھی خوں کہیں
کہ ہیں میری صبحِ عروج میں ابھی رنگ شامِ زوال کے

مری حسرتوں کو ہرا رکھے، مری کشتِ جاں کو بھرا رکھے
یہ یقیں، کہ مجھ پہ کھلیں گے در کسی روز بادِ شمال کے

شبِ تار سے نہ ڈرا مجھے، اے خدا! جمالِ دل عطا کر مجھے
کہ ترے ثبوت ہیں بیشتر تری شانِ حسن و جلال کے

کوئی کوہکن ہو کہ قیس ہو، کوئی میر ہو کہ ندیم ہو
سبھی نام ایک ہی شخص کے، سبھی پھول ایک ہی ڈال کے

مارچ ۱۹۷۷ء

○

گو مجھ سے منسوب تھی انجمن آرائی
اب میں ہوں اور حدِ نظر کی تنہائی

میں جو کھلا تو آندھی اس شدت سے چلی
جیسے توڑ ہی لے گی لالۂ صحرائی

میں نے جنوں کا صرف یہ مطلب سمجھا ہے
سودائی کو راس نہ آئی دانائی

دنیا اور خدا کا رشتہ جانے کون
جس کا تماشا ہے، وہ آپ تماشائی

چاند پہ پہنچا لیکن خود سے دور رہا
ابھی ادھوری ہے انسان کی انگڑائی

سمجھ سکا ہوں زیست کا یہ مفہوم ندیمؔ
گردشِ پیہم میں ہے رازِ توانائی

مارچ ۷۰ ۱۹۷۰ء

○

طے کروں گا یہ اندھیرا میں اکیلا کیسے
میرے ہمراہ چلے گا مرا سایا کیسے

میری آنکھوں کی چمک چاند بتا سکتی ہے
جس کو دیکھا ہی نہ جائے اسے دیکھا کیسے

چاندنی اس سے لپٹ جائے، ہوائیں چھیڑیں
کوئی رہ سکتا ہے دنیا میں اچھوتا کیسے

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

یاد کے قصر ہیں امید کی فصیلیں ہیں
میں نے آباد کیے درد کے صحرا کیسے

اس لیے صرف خدا سے ہے تخاطب میرا
میرے جذبات کو سمجھے گا فرشتہ کیسے

ذہن میں نت نئے بت ڈھال کے یہ دیکھتا ہوں
بت کدے کو وہ بنا لیتا ہے کعبہ کیسے

اس کی قدرت نے مرا راستہ روکا ہوگا
پوچھ مجھ سے کہ قیامت ہوئی برپا کیسے

گر سمندر ہی سے دریاؤں کا رزق آتا ہے
اس کے سینے میں اتر جاتے ہیں دریا کیسے

ٹوٹتی رات نے سورج سے یہ سرگوشی کی
میں نہ ہوتی تو ترا نور برستا کیسے

میں تو ہر سانس میں آجاتا ہوں فردا کے قریب
پھر بھی فردا مجھے دے جاتا ہے دھوکا کیسے

تہ میں ڈوبے ہوئے ملّاح سے پوچھے کوئی
موجۂ بحر نے کشتی کو اُچھالا کیسے

لوگ جو خاکِ وطن بیچ کے کھا جاتے ہیں
اپنے ہی قتل کا کرتے ہیں تماشا کیسے

جو مرے دستِ مشقت کے ہیں محتاج ندیمؔ
چھین لیتے ہیں مرے منہ کا نوالہ کیسے

مارچ ۱۹۷۷ء

○

جب اس کے وجود پر نظر کی
تصویر سی کھنچ گئی سحر کی

تم ایک نمازِ حسیں ہو
سرما میں ہو دھوپ دوپہر کی

چاہے وہ ہزار مختصر ہو
روشن تو ہے زندگی شرر کی

یاروں کی نظر دریچۂ قفس پر
اور مجھ کو تلاش بال و پر کی

بستی کو نگل گیا اندھیرا
جب آگ بجھی ہے میرے گھر کی

سوتے رہے شب کو رونے والے
آواز پلٹ گئی گجر کی

کعبے سے صنم کبھی نہ نکلے
جاری رہی جنگ خیر و شر کی

وقت آئے گا، جب نہیں رہے گا
مرضی نہ ہوئی اگر بشر کی

آئینے اٹھائے پھر رہے ہو
کچھ فکر کرو ندیمؔ سر کی

۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء

آدمی بھی عجیب چیز ہے

آدمی بھی عجیب چیز ہے!
جو نہیں ہے، اسے ڈھونڈتا ہے
مگر جس کو پا تا ہے
اس کو وہ جب تک کہیں کھو نہ دے
کتنا بے چین رہتا ہے!
حاضر کو غائب میں
غائب کو حاضر میں
یوں کھوجتا ہے
کہ جیسے وہ خود کھو گیا ہے!

اپریل ۱۹۷۷ء

برف جب پگھلی

برف جب پگھلی تو نکلے کوہ پیماؤں کے جسم
بستیاں جیسے اُبھر آتی ہیں سیلابوں کے بعد
جیسے آسیبِ حقیقت، خلد کے خوابوں کے بعد

اپریل ۱۹۷۷ء

○

(نذرِ اقبال)

محیطِ شام میں جب بجھ گئی شفق کی ضَو
تو آفتاب پہ ہنس دی مرے چراغ کی لَو

کسی بھی رات کو میں رات یوں نہ مان سکا
کہ میرے دل کے اُفق سے تو پھوٹتی رہی پَو

جنھیں تلاش نہ ہو آخری حقیقت کی
سمجھ نہ پائیں طلوع و غروب کی تگ و دَو

یہ راز مجھ پہ کھُلا اس کی حسن کاری سے
کہ آدمی ہے خدا کے مزاج کا پرتَو

تمام وقت کی پیمائشوں کے حیلے ہیں
کہ چاند ایک ہے لیکن ہزار ہا مہِ نَو

صدف سے تُو نے گہر تک سفر کیا تو کیا!
گہر کے بطن میں دیکھا نہ تو نے دانۂ جَو

خدا کے نُور کو چُھو کر یہ سوچتا ہوں ندیم
کہاں کہاں مجھے لائی مرے گمان کی رَو

اپریل ۱۹۷۷ء

آنے والا زمانہ

میں جو کچھ کہوں گا
وہی آنے والا زمانہ کہے گا
کہ یہ آنے والا زمانہ
مرے ماضی و حال کی نسل ہے۔
فرق اتنا سا ہے
آنے والے زمانے میں
جو کچھ بھی ہوگا
مرے حکم سے
میری تائید سے
اور میری حمایت سے ہوگا

اپریل ۱۹۷۷ء

ابھی چاند نکلا نہیں ہے!

ابھی چاند نکلا نہیں ہے
مگر آسماں کی سیاہی پہ جو دھول سی اُڑ رہی ہے
ہراول کرن نے اُڑائی ہے
پیشِ نظر آسماں کی صفائی ہے!
آخر یہیں چاندنی اپنے خیمے لگائے گی
اور رات کی ظلمتیں اس کے پہرے پہ مامور ہوں گی!

اپریل ۱۹۷۷ء

○

یہ کیا کہ عشق کروں، پاسِ آبرو نہ کروں
میں تجھ کو کھو کے خدا کی بھی جستجو نہ کروں

میں انتظارِ طلوعِ سحر میں جیتا ہوں
میں اپنا چاکِ گریباں کبھی رفو نہ کروں

تو صرف جسم نہیں ہے، ورائے جسم بھی ہے
میں تجھ کو پا کے بھی کیوں تیری آرزو نہ کروں

غیور ہوں کہ اجارہ پسند ہوں کیا ہوں
میں تجھ کو اپنے خدا کے بھی روبرو نہ کروں

یہ مشورے تو مرے ترکِ شعر کے ہیں ندیم
کہ جب بھی شعر کہوں، دل لہو لہو نہ کروں

اپریل ۱۹۷۷ء

گجردم

گجردم کے لمحے تھے
جب بند کھڑکی کے شیشوں پہ دستک ہوئی!

کون ہے؟ — میں نے پوچھا
تو ایک اور دستک ہوئی!
نیند کچی تھی
آنکھوں میں خوابوں کا نم تھا
میں کروٹ بدلنے کو تھا
جب یہ دستک مسلسل سے ہونے لگی!

کون گستاخ ہے؟ — میں نے پوچھا
پلٹ کر جو دیکھا
تو وہ پھول تھا موتیے کا
جو خوشبو کا تحفہ لیے
مسکراتا ہوا
ایک معصوم بچے کی مانند
کھڑکی کے شیشے سے لگ کر کھڑا تھا!

اپریل ۱۹۷۷ء

○

برہنہ پا میں سوئے دشتِ درد چلتا ہوں
میں اپنی آگ میں اپنی رضا سے جلتا ہوں

مرے مزاج کی چارہ گری کرے گا کون
چمن کی راہ سے، صحرا میں جا نکلتا ہوں

اگر جلا نہ سکا مجھ کو آفتاب کوئی
میں رنگِ بو کی تمازت میں کیوں پگھلتا ہوں

مجھے تو پیکرِ محسوس سے محبت ہے
میں صرف ایک تصور سے کب بہلتا ہوں

سمیٹ لیتا ہے باہوں میں میرا عشق مجھے
میں جب بھی فکر کی ڈھلوان سے پھسلتا ہوں

رُتوں کے جبر سے آزاد ہو چکا ہوں ندیمؔ
خزاں میں پھولتا ہوں، آندھیوں میں پھلتا ہوں

اپریل ۱۹۷۷ء

حسن و عشق

تجھے دیکھ کر سوچتا ہوں
کہ جو وقت تجھ سے بچھڑ کر کٹا
کتنا بے درد تھا!
تیرے چہرے کے گلزار میں ہل چلاتا رہا
تیری چکنی چمکتی ہوئی جلد سے
اپنی مشعل جلاتا رہا
سوچتا ہوں
اگر اب اُسی وقت کا سامنا ہو
تو میں تجھ کو باہوں میں لے لوں

میں چہرے پہ تیرے، محبت کی مہروں کے غنچے کھلاؤں
تری جلد کو چوم کر آئنے کی طرح جگمگاؤں
میں گزرے ہوئے وقت کو یہ بتاؤں
کہ انسان کا عشق لمحوں کا قیدی نہیں ہے!
اگر جسم اس عشق کی ابتدا ہے
تو جو انتہا ہے
وہ ہر سوچ سے ماورا ہے!

اپریل ۱۹۷۷ء

صحیفے پڑھ رہا ہوں اونچی نیچی رہگزاروں میں
کئی صدیوں کی گونجیں دفن ہیں ان کوہساروں میں

جنھیں اب روندتا ہے دیوِ ظلمت ارضِ مغرب کا
کبھی پیغمبروں کی روشنی تھی ان دیاروں میں

انہی کے مطلعِ غیرت سے کل خورشید ابھرے گا
جو اب شامل ہیں ارضِ ایشیا کے بے وقاروں میں

نہ ان کا ہاتھ ہلتا ہے نہ ان کا پاؤں اٹھتا ہے
مری بے دست و پائی کے مگر چرچے ہیں یاروں میں

مری نظروں میں یہ آتش فشانوں کے دہانے ہیں
جو مرمر کے محل اُگنے لگے ہیں سبزہ زاروں میں

تمازت اس قدر ہے دھوپ چھن جاتی ہے تیوں سے
کہیں سایہ نہیں ملتا درختوں کی قطاروں میں

نمازِ صبح کی مہلت میسر ہو تو کیسے ہو؟
اذانیں سن کے کھو جاتا ہوں چڑیوں کی پکاروں میں

میں ان لوگوں کو دعوت دے رہا ہوں سیرِ صحرا کی
جو کھو بیٹھے ہیں اپنی راہ پھولوں کے حصاروں میں

ندیم اب تو سمجھ لو بات قدرت کے علائم کی
ستارے کچھ تو کہتے ہیں اشاروں ہی اشاروں میں

اپریل ۱۹۷۷ء

طلوع

رات ایسی بھی جابر نہیں ہے
وہ آئی ہے
لیکن تمھارے لیے
کچھ نہ کچھ ساتھ لائی ہے
اس کے سیہ پیرہن پر نہ جاؤ
کہ دامانِ ظلمت میں اس کے
ستارے بھی ہیں
صبح نو کے اشارے بھی ہیں

اپریل ۱۹۴۷ء

فائرنگ

یہ مانا
کہ تم نے تو گولی کی آواز سن کر کہا تھا
کہ گولی چلی ہے
مگر میں
چٹختی ہوئی ہڈیوں
اور اُبلتے ہوئے خون کے شور میں
گولی چلنے کی آواز سننے سے پہلے ہی
اپنی سماعت کی حیثیت کو دفنا چکا تھا

اپریل ۱۹۴۷ء

○

اگر نہ درد مری روح میں اُتر جاتا
میں جیسا بے خبر آیا تھا، بے خبر جاتا

ابھی کہیں نہ کہیں صدق بھی ہے عدل بھی ہے
میں ورنہ خیر کے اثبات سے مُکر جاتا

فضائے تیرہ سے مانوس تھی نگاہ مری
فلک سے ورنہ میں ورا نہ کیوں گزر جاتا

کہیں خلاؤں میں آدم کی لاش کھو جاتی
زمیں پہ آ کے اگر زندگی سے ڈر جاتا

ہر ایک ڈوبنے والا یہ سوچتا ہے، کہ میں
بھنور سے بچ کے نکلتا تو پار اُتر جاتا

تمام عمر مرا دشت میرے ساتھ رہا
تمام عمر تمنّا رہی کہ گھر جاتا

مرا کوئی بھی نہیں کائنات بھر میں ندیم
اگر خدا بھی نہ ہوتا تو میں کدھر جاتا

مئی ۱۹۷۷ء

ایک نظارہ

شہراہِ حیات پر کھڑا ہوں
اور دیکھ رہا ہوں یہ نظارا

عورت کو جھٹک کے بازوؤں سے
اک شخص نے کار سے اُتارا

عورت نے طویل چیخ ماری
اور کار نے بھر لیا طرارا

اِک سنسنی چار سُو رواں تھی
ٹوٹا ہو فلک سے جیسے تارا

ناگاہ مرے قریب آکر
خود میرے وجود نے پکارا:
کب ہوتا ہے چار آنسوؤں سے
پورا اک نسل کا خسارا
کیا تیرے ضمیر میں نہیں ہے
غیرت کا بچا کھچا شرارہ
اشکوں سے نظام کیسے بدلیں
اے شعر و سخن کے بزم آرا!

○

غروبِ مہر کی کس نے خبر اُڑائی ہے
مرے پہاڑ کی چوٹی ابھی حنائی ہے

مجھے حدودِ فلک کو عبور کرنے دو
وہاں چلا ہوں جہاں ذہن کی رسائی ہے

ہے اس کی زد میں خلا اور ماورائے خلا
یہ مشتِ خاک کہاں خاک میں سمائی ہے

مرے خدا نے کیا تھا مجھے امیرِ بہشت
مرے گنہ نے رہائی مجھے دلائی ہے

چہک رہے ہیں شبستانِ شاہ کے گنبد
سیاہِ وقت نے ترتیبِ شب منائی ہے

اتر سکو تو نشیبِ حیات میں اُترو
فرازِ دار پہ جانا تو خود نمائی ہے

بہت عجیب سی ہے رہروؤں کی گمراہی
عجیب تر مگر اندازِ رہنمائی ہے

امیرِ دوست کے ٹھنڈے مصافحے سے کھلا
کہ اس کا گھر ہی نہیں، جسم بھی طلائی ہے

ہے شیخِ شہر کو عمامہ و قبا کا جنوں
اگرچہ زہد کی پہچان بے ریائی ہے

پھٹے پھٹے سے ہیں کیوں ہونٹ میرے کھینچوں کے
اگر خدا کے تصرف میں سب خدائی ہے

اسے قبول نہ کر پائیں گے مرے نقّاد
بہت عجب مرا طرزِ غزل سرائی ہے

ندیمؔ لالۂ صحرا ثبوت ہے اس کا
کہ آسماں نے زمیں سے شکست کھائی ہے

مئی ۱۹۷۷ء

ماضی و حال

وہ دن بھی عجب بہار دن تھے
جب تیرے جمال کی مہک سے
سرشار شبیں، خمار دن تھے

یہ دن بھی عجب غبار دن ہیں
جب تیرے خیال کے جلو میں
دیوار شبیں، حصار دن ہیں

مئی ۱۹۷۷ء

○

جانے کس کی قسمت میں تکمیلیں ہیں
اتنے سائے ہیں، جتنی قندیلیں ہیں

ظلم و ستم کی جتنی بھی تاویلیں ہیں
بودی منطق ہے اور پوچ دلیلیں ہیں

ہم سب اپنا آپ چھپاتے پھرتے ہیں
ہم انسان، فرشتوں کی تمثیلیں ہیں

کتنی سکڑ گئی ہے جد و جہدِ حیات
یا احکام ہیں، یا اُن کی تاویلیں ہیں

حل نہ ہُوا مغرب کا یہ سفاک تضاد
پاؤں تلے لاشیں، سر پہ انجیلیں ہیں

مئی ۱۹۷۰ء

برگ و شجر

پتّے کو ہوا نے ورغلایا
اور اس نے شجر کا چھوڑ کر ساتھ
کچھ اور بلند ہونا چاہا
جھونکوں نے جب اس کو گدگدایا
تالی سی بجا کے اُڑ گیا وہ
جب نقطۂ اوج چھو کے پلٹا
چکراتا ہُوا زمیں پہ آیا
اب ڈھونڈ رہا ہے خار و خس میں
اپنے بچھڑے شجر کا سایا

مئی ۱۹۷۰ء

○

اہلِ محفل کا تماشا دیکھوں
جس کو دیکھوں اسے تنہا دیکھوں

ہر گزرتے ہوئے پل کے پیچھے
ایک فردا پسِ فردا دیکھوں

جب بھی دیکھوں کوئی ٹھٹھرا ہوا شہر
وقت کا نقشِ کفِ پا دیکھوں

قعرِ دریا میں سفینہ ڈھونڈوں
کفِ دریا سرِ دریا دیکھوں

جب بھی سوچوں کہ حقیقت کیا ہے
رقص میں ایک بگولا دیکھوں

وہ تو انساں کی صدا بھی نہ سُنیں
اور میں پتھر کو بھی گویا دیکھوں

وہ فقط ہیبتِ صحرا دیکھیں
اور میں لالۂ صحرا دیکھوں

کیا بتاؤں کہ میں کیا کیا دیکھوں
تجھ میں تجسیمِ تمنا دیکھوں

تیری بیگانہ روی کی سوگند
میں تجھے آج بھی اپنا دیکھوں

جب ترا لمحۂ رخصت یاد آئے
ٹوٹتا ایک ستارا دیکھوں

عمر بھر کے سفرِ ظلمت میں
روشنی کا وہی نقطہ دیکھوں

دُور سے میں تری پلکیں گن لوں
پاس جاؤں تو ہیولیٰ دیکھوں

اب تو اس ابر سے بوندیں برسیں
کب تک اُڑتا ہُوا سایہ دیکھوں

ساری دنیا کے حسینوں میں ندیم
میں تو بس ایک ہی چہرہ دیکھوں

مئی ۱۹۷۷ء

عقل و عشق

اے اہلِ عشق! عقل سے اس درجہ بیر کیوں
جب عشق کا بھی رازِ توانائی عقل ہے

تم ماورا کی دھند میں سرشارِ جستجو
اسرارِ کائنات کی شیدائی عقل ہے

ہے منتہائے عشق تو سچائی سربسر
سچائی کے وجود کی زیبائی عقل ہے

تعمیرِ شخصیت کے لیے دونوں کیمیا
تنہائی عشق، انجمن آرائی عقل ہے

تخلیقِ عرش و فرش کی بنیاد عشق تھی
اجزائے ریزہ ریزہ کی یکجائی عقل ہے

مئی ۱۹۷۷ء

○

ہم اُٹھ کے کس کی انجمن سے
بیٹھے ہیں وطن میں بے وطن سے

اب عام کرو جمال اپنا
سورج کا وجود ہے کرن سے

تم لاکھ چھپاؤ فصلِ گل کو
مہکار اُمڈ پڑے چمن سے

ممکن ہی نہیں بدن نہ بولے
آواز رُکے نہ پیرہن سے

انعام سمجھ کے زخم کھائے
سیکھا یہی زندگی کے فن سے

تربت سے گلاب بن کے پھوٹا
جو حسن نہ چھپ سکا کفن سے

مئی ۱۹۷۷ء

مرا طرزِ مسلمانی

میں قرآں پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی
مرے ایمان کی ضد ہے مرا طرزِ مسلمانی
ہے صدیوں سے بسیرا مسندِ اضداد پر میرا
مرے اعمال جامد ہیں، مرے اقوال طوفانی
ارادے منفعل ہیں، آرزوئیں مضمحل میری
عدوئے ارتقا ہے میرے روز و شب کی یکسانی
عجب کیا ہے، مجھے میرے مقاصد ہی سے اکتائے
مرا ذوقِ خود آرائی، مرا شوقِ تن آسانی
خدا اس پر بھی، جانے کیوں، افق پر مسکراتا ہے
قبائے شب سے جب چھنتی ہے صبحوں کی زرافشانی

مئی ۱۹۷۷ء

برفانی چوٹی پر

برف کے مینار پر بیٹھے ہوئے ہیں رہنما
اور بنیادوں میں جاری ہے پگھلنے کا عمل
اس بلندی پر بھی ہیں سورج سے کتنے بے نیاز
ڈالتا ہے برف کے پیکر میں جو سوزِ خلل
ان بزرگوں کو یہ منظر کیوں نظر آتا نہیں
ایک سیلِ آب میں محصور ہیں دشت و جبل
کھا گئی جب دھوپ بنیادوں کی برفانی سلیں
کون ان کو تھامنے آئے گا بجز دستِ اجل

مئی ۱۹۷۷ء

یہ راہبر

یہ رہبر ہیں کسی کو باخبر ہونے نہیں دیں گے
گزر جائے گی شب، لیکن سحر ہونے نہیں دیں گے

مجھے محبوس رکھیں گے وہ وعدوں کی فصیلوں میں
کسی دیوار میں تعمیرِ در ہونے نہیں دیں گے

مجھے مامور رکھیں گے وہ بارش کی دعاؤں پر
مگر بوندوں سے میرا حلق تر ہونے نہیں دیں گے

مجھے محصور رکھیں گے عجب ہر رنج کے غم میں
سفر کرنے نہیں دیں گے، بسر ہونے نہیں دیں گے

وہ مجھ سے کام لیں گے دشت کو گلشن بنانے کا
مگر اک گل بھی میرے زیبِ سر ہونے نہیں دیں گے

اگر سورج نے آدھے آسماں کی راہ طے کر لی
تو جب بھی میرے گھر میں دوپہر ہونے نہیں دیں گے

اگر کچھ اور آگے بڑھ گیا ادراکِ انسانی
تو سائے کو بھی میرا ہمسفر ہونے نہیں دیں گے

مبادا اس کے ہاتھوں ہی سے مل جائے شفا مجھ کو
مرے قاتل کو بھی وہ چارہ گر ہونے نہیں دیں گے

مجھے تکفیر کی آلودگی سے لاد ڈالیں گے
وہ میری اک دعا بھی کارگر ہونے نہیں دیں گے

زمیں کی قوتِ رویدگی برحق سہی، لیکن
کسی بھی شاخ کو وہ بارور ہونے نہیں دیں گے

نکالیں گے قفس سے طائروں کو، زیرِ مجبوری
مگر جسموں میں پیدا بال و پر ہونے نہیں دیں گے

سنیں گے خوب خوب نغمے، مگر جب جی نہ چاہے گا
ہوا کو بھی چمن میں نغمہ گر ہونے نہیں دیں گے
نظر رکھیں گے وہ اہلِ وطن پر اس مہارت سے
کوئی بھی مسئلہ زیرِ نظر ہونے نہیں دیں گے
یہ مانا آج ہر انساں کی قوت ہے شعور اس کا
مگر اس رسم کو عام اس قدر ہونے نہیں دیں گے
ندیمؔ اپنے ہنر سے دست کش ہونا ہی بہتر ہے
کہ یہ پتھر مجھے آئینہ گر ہونے نہیں دیں گے

مئی ۱۹۷۷ء

○

(نذرِ اقبال)

سورج کو نکلنا ہے، سو نکلے گا دوبارا
اب دیکھیے کب ڈوبتا ہے صبح کا تارا
جب ایشیا جاگے گا تو یہ جینے نہیں دے گا
اس دھوپ کی نگری پہ اندھیروں کا اجارا
مغرب میں جو ڈوبے اسے مشرق ہی نکالے
میں خوب سمجھتا ہوں مشیت کا اشارا
پڑھتا ہوں جب اس کو تو ثنا کرتا ہوں رب کی
انسان کا چہرہ ہے کہ قرآن کا پارا
جس ہاتھ نے تنہائی میں آنسو مرے پونچھے
پھولوں پہ اسی ہاتھ نے شبنم کو اتارا

جی ہار کے تم پار نہ کر پاؤ ندی میں
ویسے تو سمندر کا بھی ہوتا ہے کنارا

اِس وقت ضرورت ہے دُعا کی نہ دعا کی
صرف اہلِ وطن اپنے وطن کا ہیں سہارا

جنت ملی جھوٹوں کو اگر جھوٹ کے بدلے
سچوں کو سزا میں ہے جہنم بھی گوارا

یہ کون سا انصاف ہے اے عرش نشینو!
بجلی جو تمھاری ہے تو خرمن ہے ہمارا

مستقبلِ انسان نے اعلان کیا ہے
آئندہ سے بے تاج رہے گا سرِ دارا

جون ۱۹۷۷ء

○

موت برحق ہے، مگر موت کا چرچا نہ کریں
آپ انسان کی تقدیر کو رسوا نہ کریں

ہم نے جنت کے عوض خلوتِ دنیا پائی
آسمانوں سے فرشتے ہمیں جھانکا نہ کریں

کر دیا حسنِ حقیقت نے کچھ ایسا مبہوت
لوگ اب حسنِ تصور کا تقاضا نہ کریں

حال و ماضی نے ہمیں غم کے سوا کچھ نہ دیا
اور کیا کام کریں، گر غمِ فردا نہ کریں

رہنماؤں سے بس اتنا ہی ہمیں کہنا ہے
کہ وہ الفاظ کے ناموس کو بیچا نہ کریں

ہم نے کس صبر سے ہر جبر سہا ہے، لیکن
اب جو ہم چیخ اُٹھیں، آپ بھی غصہ نہ کریں

ایک چٹان کے بس اک بل سے بکھر جائیں ہم
اور طوفان بھی آجائیں تو ٹوٹا نہ کریں

اُڑ نہ جائے کہیں یادوں کی نمی دھوپ کے ساتھ
آپ شبنم کی طرح ذہن پہ اترا نہ کریں

آبلے پھوٹتے ہی پھول کھل اُٹھتے ہیں ندیمؔ
ہم تو بے حرمتیٔ دامنِ صحرا نہ کریں

جون ۱۹۷۷ء

تعارف

ابھی جو ایک ہیولیٰ یہاں سے گزرا تھا
وہ کتنے سال سے
ہر روز
عین اس لمحے
یہیں سے — ٹھیک اسی موڑ سے گزرتا ہے!
میں کل برائے تعارف جب اس کی سمت گیا
تو وہ یہ کہتا ہُوا میرے پاس سے گزرا:
ہے وقت نام مرا
اور گزرنا کام مرا!

جولائی ۱۹۷۷ء

۱۹۷۷ء

اُدھر سورج اُبھرتا ہے
اِدھر شاموں کے سناٹے
شفق میں بھیگ کر
نور و نوا کے منتظر ذہنوں کے صحنوں میں اُترتے ہیں

اُدھر مشرق سے سیلابِ تجلّی جب اُفق کے ساحلوں کو پھاند جاتا ہے
اِدھر مغرب سے تاریکی کے فوارے اُبل کر
روشنی کی سب لَوؤں کو چاٹ لیتے ہیں

اُدھر موسم بدلتا ہے
اِدھر گل تو نہیں کھلتے مگر پتھر، جو یخ تھے، تپنے لگتے ہیں

اُدھر پتّوں پہ شبنم آئنے بن کر اُترتی ہے
اِدھر ٹوٹے ہوئے ذرّے کا جوہر
اپنے دانتوں میں پیسے شہ رگِ زمیں کی
دندناتا پھر رہا ہے
جیسے اب جو کچھ بھی ہوگا، صرف اس کے حکم سے ہوگا!

اُدھر کے اور اِدھر کے پاٹ میں انسان دب کر رہ گیا ہے
اور چکّی چلنے والی ہے!

جولائی ۱۹۷۷ء

ثبوتِ حق

(منصورہ شیخ کی نذر)

بہت حسیں تھی!
مجھے خدا کی قسم، وہ لڑکی بہت حسیں تھی!
وہ اپنے باطن کے حسن سے اس قدر منوّر تھی
اتنی روشن تھی
اور پھر اتنی باخبر تھی
کہ اپنے ذہن و ضمیر کے اس جمال کو
اپنے سیدھے سادے سے بھولے بھالے سے قدسیوں کے
سے خال و خد میں چھپائے رکھتی تھی

لیکن اس کی جمیل سوچوں سے جب شعاعیں سی پھوٹتی تھیں
تو اس کی آنکھوں میں تارے سے جھلملانے لگتے تھے
اور سارے نقوش یوں جگمگانے لگتے تھے
جیسے سورج کے نورِ باطن سے
کائناتِ حیات زرپوش ہو رہی ہو!

خدا، جو تخلیقِ حسن کی انتہا پہ قادر ہے
وہ جو اِس انتہا پہ قادر ہے
وہ جو باطن کا عکس ظاہر پہ ڈالتا ہے تو معجزوں کی نمود
ہوتی ہے!

حسن کارِ ازل بھی ہے
اور حسن کارِ ابد بھی ہے
حسن — اس کی جملہ صفات کا ایک ایسا عنواں ہے

جس کے ایک ایک حرف سے
وہ حسین —
وہ بے حساب حد تک حسین
وہ حسنِ جذبہ و آرزو کا اک شاہکار لڑکی
ثبوتِ حق بن کے جھانکتی تھی!

جولائی ۱۹۷۷ء

○

دل و جاں بیچ کے احسان اُتارے اس کے
خود کو ناپید کیا، نقش ابھارے اس کے

اک شبِ قرب ہُوئی یوں مری راتوں پہ محیط
جگمگائیں مری آنکھوں میں ستارے اس کے

فصلِ گل آتے ہی بن عازمِ صحرا ہوں اگر
مجھ سا وحشی ہی سمجھتا ہے اشارے اس کے

کس قدر مادرِ گیتی ہے کشادہ آغوش
جتنے انسان ہیں، سب راج دلارے اس کے

وہ تو یکتا ہے، مگر عالمِ تنہائی میں
میں نے گھبرا کے کئی نام پکارے اس کے

میں تو اس عزم سے طے کرتا رہا دشتِ حیات
اک نیا شہر بساؤں گا کنارے اس کے

موت بھی آئے گی اب اس کے حوالے سے ندیمؔ
کہ میں زندہ بھی رہا ہوں تو سہارے اس کے

جولائی ۱۹۷۷ء

معکوس

سربرآوردہ لوگوں کی محفل میں
اک شخص نے
(اپنے حلیے سے جو نیم دیوانہ لگتا تھا
لیکن جو فن کار تھا)
اک عجب بات کہہ دی!

وہ بولا:
"زمیں، آسماں ہے کئی آسمانوں کا
اور آسماں درحقیقت زمینیں ہیں
جو آسماں لگ رہی ہیں زمیں سے!"

یکایک سبھی سربرآوردہ اصحاب یوں ڈر کے اُٹھے
کہ جیسے وہ فن کار (جو نیم دیوانہ لگتا تھا)
ان کے سروں پر کھڑا ہو گیا تھا!

جولائی ۱۹۷۷ء

نامکمّل

کوئی بھی رات نہ کہلا سکے مکمّل رات
ہر ایک رات ستاروں سے جھلملی چھلنی ہے
اگر گھٹا اسے تکمیل کی طرف لے جائے
تو خود گھٹا کی عبا میں چھپے ہوئے کوندے
لپک لپک کے اسے تار تار کرتے ہیں
دریدہ دامنی تیرگی ہے شب کا نصیب
اسی لیے تو فقط روشنی ہے سب کا نصیب

جولائی ۱۹۷۷ء

ایک بیل سے

کھال بہت موٹی ہے تمہاری!
سَن سَن کرتے کوڑے کھاؤ
کان ہلاتے جاؤ!
درد اگر ہڈی میں اُترے
سینگ نہ کام میں لاؤ!
دُم کو کس کس کر خود اپنی پیٹھ پہ مارو
اور نئے کوڑے کی موسیقی سننے کو
سر نیہوڑاؤ!
کُھر سے مٹی کھود کھود کر تال ملاؤ!
اور جب ساری کھال اُڑ جائے
صرف ذرا سا ڈکراؤ
پھر چپکے سے مر جاؤ!

اگست ۱۹۷۷ء

○

جو حقیقت میں سخن ور ہوگا
وہی اندر سے منوّر ہوگا

جس نے موجوں سے بغاوت کی ہے
اس صدف میں کوئی گوہر ہوگا

مبتلا کرب میں ہیں ارض و سما
نئی تخلیق کا چکر ہوگا

میں نے جب بند کے در کھول دیئے
سامنے ایک سمندر ہوگا

چارہ گر دل پہ رکھے ہاتھ آیا
آستیں میں کوئی خنجر ہوگا

بحث کرنے کا جب آئے گا مزا
سامنے داورِ محشر ہوگا

چھوٹے دشمن پہ ترس آتا ہے
اصل دشمن مرا ہمسر ہوگا

مدتوں بعد یہ دستک کیسی!
ہو نہ ہو، کوئی گداگر ہوگا

میں بٹا جاتا ہوں بوٹی بوٹی
یہ تماشا بھی دن بھر ہوگا

امن کا عہد تب آئے گا ندیمؔ
جب نہ دارا نہ سکندر ہوگا

اگست ۷۷ء ۱۹

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں
لیکن وہ لہو کہاں چھپاؤں
جو میرے بھنچے ہوئے لبوں میں
رستے کے لیے رُکا ہوا ہے

ان پر کہ جو میرے راہبر تھے
اور جن کا کمالِ رہنمائی
جلتے ہوئے گھر دکھا گئے تھے

ان پر کہ جو شیر بن کے گرجے
غرائے، دہاڑے، دندنائے
اور کھال سمیت جھول آئے

ان پر جو دیے جلانے آئے
لیکن جو فریبِ نور دے کر
ظلمات کا رس نچوڑ لائے

ان پر کہ جو عشق کے بہانے
شہروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے
اک دشتِ تہی کو ہسار لانے

ان پر کہ جو حفظِ فن کی دُھن میں
فن کو زنجیر کرنے نکلے
خوشبو کو اسیر کرنے نکلے

ان پہ کہ جو دیکھتے تھے سب کچھ
پر چیخ بھی سسد نہ کر سکے وہ
جی بھی نہ سکے، نہ مر سکے وہ

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں
لیکن وہ لہو کہاں چھپاؤں
جو میرے بھینچے ہوئے لبوں میں
رسنے کے لیے رکا ہوا ہے

اگست ۱۹۷۷ء

○

سلسلے بند بھی کر، ہول بھری راتوں کے
گنگ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے

کوئی پل اس کی جدائی کا تہی دست نہ تھا
میں تو انبار لیے پھرتا ہوں سوغاتوں کے

چھت ٹپکتی ہے تو لگ جاتی ہے یادوں کی قطار
سینے احسان ہیں دوگونہ یہ برساتوں کے

نہ ملے زہر تو اپنا ہی لہو پیتے ہیں
جام خالی نہیں رہتے کبھی سقراطوں کے

سفرِ عشق میں گر دشت سلگتے ہیں ندیم
اہلِ دل کے لیے یہ فرش ہیں باناتوں کے

اگست ۷۷ء

ایک فرد ـــــ ایک تاریخ

وہی ہُوا، جو سدا اہلِ دل کے ساتھ ہُوا
کہ بن گیا ہدفِ طعن، اس کا چاکِ قبا

وہ کچھ بھی تھا، مگر آسائشِ دل و جاں تھا
صدا کی شاخ پہ جب اس کا حرف پھول کھِلا
وہ دشت بھی، کہ جو بنجر تھے کتنی صدیوں سے
نمو کی آنچ جو پہنچی تو سبزہ زار ہُوئے
وہ کوہسار جو یخ بستگی کے حبس میں تھے
جب اس کے لمس سے چٹخے تو گُلعذار ہُوئے

وہ کچھ بھی تھا مگر اس وقت اک وہی تو تھا
کہ جس نے بڑھ کے مقفل دہن کو کھولا تھا

مرا جوان وطن، میرا بے زبان وطن
رکھا گیا تھا جسے گنگ عہدِ طفلی سے
پھٹے پھٹے ہُوئے زخمی لبوں سے بولا تھا
یہ اس کے حرف کا اعجاز تھا کہ اس کے طفیل
وہ لوگ جو کئی نسلوں سے خاک بر سر تھے
اُٹھے تو سینۂ گیتی میں اک دھمک سی اُٹھی
بہت لطیف اجالے سے شب چمک سی اُٹھی
زمیں کے بوجھ زمیں کے سنگار بن کے چلے
خزاں سے زرد ندی ہُوئی وسعتوں میں پھیل با
خرامِ ابر، ہوائے بہار بن کے چلے

وہ کچھ بھی تھا مگر اُس دورِ نو کا بانی تھا
کہ جس میں سنگِ سرِ راہ، با وقار ہُوا
وہ ایک فرد جو اُٹھا تو ایک فرد نہ تھا
وہ ایک شخص جو برسا تو بے شمار ہُوا
فرازِ عصر سے جھرنا سا ایک پھوٹا تھا
جو بے حسی کے خم و پیچ سے گزرتا ہُوا
دل و دماغ میں اُترا تو بے کنار ہُوا

ستمبر ۱۹۷۷ء

○

(نذرِ اقبال)

اللہ! قیامت اگر آئی ہے تو ٹل جائے
پھولی ہے جو برسوں میں وہ اک شاخ تو پھل جائے

مرجھائے کوئی گل نہ ستارہ کوئی ٹوٹے
انسان سنبھل جائے تو کیا کچھ نہ سنبھل جائے

کیوں عشق کی اس آنچ سے دل موم نہ ہو پائیں
پتھر کو بھی جس آنچ پہ رکھو تو پگھل جائے

دشوار ہے انکار کو انکار سمجھنا
انکار سے چہرے کا اگر رنگ بدل جائے

غنچوں کو تو درکار ہے آنا سحر کا
شبنم کو یہ ڈر ہے کہ کہیں رات نہ ڈھل جائے

ہر موڑ پہ بیٹھا ہے یہ خونخوار درندہ
جو لمحہ گزر جائے اسے وقت نگل جائے

چپکے سے ہوا میرے خرابے میں جب آئے
گو ضبط کرے لاکھ مگر چیخ نکل جائے

انساں ہے اک جسم کی اک جاں کی شراکت
اور تن جھلس جائے تو وجدان بھی جل جائے

شاعر کو یہ ضد، چاند سے کم کچھ نہیں لے گا
پھولوں پہ مگر اس کو دیکھے تو بہل جائے

ستمبر ۱۹۷۷ء

بامعنی

کبھی جب میں زمیں کی رفعتوں سے
آسماں کی پستیوں میں جا اترتا ہوں
تو دن اور رات کی تقسیم
ماہ و سال کی تقویم
اور اسرار کی تفہیم
یوں ایک ایک کر کے میرے کیسۂ حکمت سے گرتی ہیں
شجر سے جیسے پتے ٹوٹنے لگتے ہیں پت جھڑ میں!

اگر میں آسماں پر وہ نہیں ہوں، جو زمیں پر ہوں
تو میں جو کچھ بھی ہوں، اپنی زمیں سے ہوں
اگر انساں ہوں تو اپنی مٹی کے یقیں سے ہوں!

ستمبر ۱۹۷۷ء

○

مجرم جو صدا کا تھا، وہ زنجیر بپا ہے
اور خانۂ زنجیر کا سرمایہ صدا ہے[1]

بستی سے گزرنا اسے دشوار ہوا ہے
ہر شخص فقط ایک طرف دیکھ رہا ہے

دیکھا ہے جب آئینۂ فن میں، تو کھلا ہے
ہر حسن کو انسان نے تخلیق کیا ہے

ساحل کی چٹانوں کے اگر سبز ہیں چہرے
پتھر میں بھی اک سلسلۂ نشو و نما ہے

[1] متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم — غالب

گھبرایا ہوں جب بھی میں گرانباریٔ شب سے
مشرق سے تجلّی کا دریچہ سا کھلا ہے

نکلا ہوں میں جب جھانک کے آئینہ جاں میں
جس شخص کو دیکھا، مجھے اپنا سا لگا ہے

انسان کو انسان سمجھنا بھی تو سیکھو
اچھا ہے سو اچھا ہے، برا ہے سو برا ہے

مفہوم میں کچھ فرق ہے، الفاظ وہی ہیں
دیوار پہ لکھا ہوا میں نے بھی پڑھا ہے

یہ عین بیاباں میں شجر میری انا کا
باہر سے اگر خشک ہے، اندر سے ہرا ہے

گر جبر کرے کوئی تو میں جبر سہوں کیوں
جو اس کا خدا ہے، وہی میرا بھی خدا ہے

زندہ ہوں کہ شاید اُسے احساسِ وفا ہو
صد شکر کہ مشیت مرا آئینِ وفا ہے

اِک عمر سے میں تیرے تعاقب میں رواں ہوں
اے وقت! ترے کیسۂ تقدیر میں کیا ہے

ستمبر، ۱۹۷۰ء

○

(نذرِ اقبال)

کبھی ہو حدِ نظر تک پروں کو پھیلا دوں
میں اپنے آپ میں تحلیل ہونے لگتا ہوں
الٰہی! جب بھی مروں میں تو اس ادا سے مروں
کرن کی طرح، گلوں میں نفوذ کر جاؤں
تو آدمی کا ہے معبود، اور عظیم و جلیل
میں قدسیوں کا ہوں مسجود، اور خوار و زبوں
وہ درد مجھ کو ملا، جس سے اجنبی ہیں سبھی
کہوں تو کس سے کہوں اور سہوں تو کیسے سہوں

تمام حشر ہوں، لیکن سکوں ہے چہرے پر
میں جب بھی آئنہ دیکھوں، بہت عجیب لگوں
میں وہ ہوا ہوں، گھٹا جس کی ہمسفر نہ ہوئی
سواب میں آگ کی مانند جنگلوں میں چلوں
شعاعیں چننے چلا تھا میں آسماں کے لیے
فلک کے گنبدِ بے در میں پھڑپھڑا نا پڑوں
خدا نہیں تو کوئی آدمی کہیں مل جائے
میں کیا کروں اگر اتنی بھی آرزو نہ کروں
طنابِ خیمۂ گردوں ہوں، اے فرشتۂ موت!
میں آسماں کی خاطر زمیں میں اتر دوں
ندیم جبر ہے یا اختیار ہے میرا
کہ جس کو مرتا ہوا پاؤں اس کو مٹنے دوں
میں روشنی کے تسلسل کو ٹوٹنے ہی نہ دوں
میں شمع بن کے بجھوں آفتاب بن کے جلوں

شمیمِ گل ہوں تو کوندے کی طرح کیوں لپکوں
میں سہج سہج فضا میں حلول کرتا رہوں
مری فنا میں بقا کے ہزار تیور ہیں
میں خون ہو کے دلِ کائنات میں دھڑکوں
چراغِ آخرِ شب ہوں، مگر تمنا ہے
مسافروں کو افق پر دکھائی دوں تو بجھوں
میں آدمی ہوں عجب طرح کا ستارہ مزاج
کہ بار بار سرِ اوجِ آسماں ٹوٹوں
مری اکائی کو جب بھی غنیم للکارے
میں برق بن کے گروں، میں بگولا بن کے اٹھوں
مرے وجود کا مفہوم اجتماع میں ہے
خدا کرے کہ میں انسان سے خدا نہ بنوں
وہی جو دن کو سُنی اَن سُنی کیے جائے
تمام رات میں سرگوشیاں اُسی کی سُنوں

ہوا مجھے بھی لگی ہے نئے زمانے کی
کہ میں بھی اپنے گریباں کے چاک خود سی لوں
خدا ملا تو ہوئی جستجو تمام ندیم
سو طے کیا کہ اب اپنی تلاش میں نکلوں

نومبر ۱۹۷۷ء

تغیّر

ہمارے یہ روز و شب عجب ہیں
کہ روزِ روشن پہ تیرگی کا گماں ہوتا ہے
درزِ شبِ تیرہ کے کناروں سے
جانے کتنے ہزار خورشید جھانکتے ہیں!
طلوع کے سارے منظروں پہ
غروب کے سائے چھا رہے ہیں!
غروب کی سب شکستگی
اِک طلوع کے انتظار میں سانس روکے بیٹھی ہے!

ساری تقویم کو تغیر کا سامنا ہے
تمام اقدار
سب روایات
اپنے سانچوں کو توڑ دینے کے ایک آشوبِ مستقل میں اسیر ہیں
اور جتنے انسان زندہ ہیں — دم بخود کھڑے ہیں
جو مر چکے ہیں
وہ ریگ زارِ عدم کے ٹیلوں پہ گر گئے ہیں
وہ منتظر ہیں
کہ پتھروں سے گلاب پھوٹیں
ہواؤں میں روشنی بہے
بارشوں میں موتی گریں
خزاں خوشبوئیں لٹائے!
وہ منتظر ہیں
کہ آسمانوں کے در کھلیں

اَن گنت فرشتے امڈ پڑیں
اور زمین پر سجدہ ریز ہوتے ہی
آسمانوں کو لوٹ جانا ہی بھول جائیں!

تمام موسم بدل رہے ہیں
تمام معیار مٹ رہے ہیں
تمام افکار منقلب ہیں
جو سر بہ آور وہ تھے
وہ سر در گریباں بیٹھے ہیں
اور وہ جو کہ خاک بر سر تھے
اس قدر سربلند ہیں
جیسے اپنے قد سے
زمین اور آسماں کے مابین کی مسافت کو ناپتے ہیں!
وہ آہنی در

جو نصب تھا فرش و عرش کے درمیان
آخر پگھل رہا ہے!
تقدس اور احترام کے مرکزوں سے پہرہ ہٹا ہوا ہے
خدا سے انساں کا ربط
سجدے سے آگے بڑھ کر
معانقے میں بدل رہا ہے!

دسمبر ۱۹۷۷ء

○

سمٹتی ہے چاندنی کو روایت حجاب کی
یہ روشنی ہے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی

خوشبو اسیرِ رنگ، تغزّل اسیرِ حرف
ہر پیکرِ جمال کو لت ہے نقاب کی

سمجھا ہے کون وقت کی رفتار کا مزاج
لمحوں میں کھو گئیں کئی صدیاں شباب کی

اعجازِ خاک سے ہیں وہ کس درجہ بے خبر
پتھر سے ڈھالتے ہیں جو کلیاں گلاب کی

خالی پڑی رہیں گی جہنم کی وسعتیں
یاد آئے گی نہ حسنِ کرم کو حساب کی

اللہ! تو نے موت کو بھی ساتھ کر دیا!
میں نے تو زندگی ہی فقط انتخاب کی

پوچھا تھا اک سوال ازل میں ندیمؔ نے
اب تک اسے طلب ہے خدا سے جواب کی

دسمبر، ۱۹۷۷ء

○

خلق تکمیل کی ہے دیوانی
میرا سرمایہ میری حیرانی

علم نے کربِ اضطراب دیا
کس قدر پُرسکوں تھی نادانی

حوصلے آسماں کو چھونے کے
اور میں اپنا آپ زندانی

چاند سے بڑھ کے لطف دے شاید
چاند پر سے زمیں کی تابانی

پیڑ کو توڑ کر بہت خوش ہیں
اتھلی اتھلی ہوائیں طوفانی

تیز بارش نے چھت پہ دستک دی
جب مرے گھر میں بھر گیا پانی

خود پشیماں کے کام آتی ہے
بعد از وقت کی پشیمانی

اس کڑی دھوپ میں بھی جاری ہے
چند یادوں کی شبنم افشانی

جنوری ۱۹۷۸ء

رشتے

نہیں! — کوئی رشتہ بھی اس دہر کا — بے نہایت نہیں
اِک خدا ہے
جو بے ابتدا اور لا انتہا ہے
کسی سے مگر اُس کا بھی کوئی محسوس رشتہ نہیں ہے
یہ محسوس رشتے تو جسموں کی حدّت سے تخلیق پاتے ہیں
اور وہ جو بے جسم ہے
اس سے رشتہ کوئی کیا نکالے!

ورائے بدن ایک رشتہ وہ ہے
جس میں روحوں کی آپس میں تحلیل ہوتی ہے!

اپنے خدا سے یہ رشتہ تو امکان میں ہے
مگر اس کی روحِ بسیط اک سمندر سا ہے!
قطرہ اگر اس میں مل جائے
اپنی انا کھو کے نابود ہو جائے
اور یہ حقیقت تو اہلِ خدا کو بھی معلوم ہو گی
کہ نابود ہونا نہایت ہے
(نابود ہونا نہایت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟)

وہی برف ۔۔ جو سردیوں میں پہاڑوں کے سینے سے لگ کر
پڑی سو رہی تھی
کڑی دھوپ سے رشتہ پیدا ہُوا تو پگھل کر پہاڑوں سے اُتری!
وہ دریاؤں میں دندناتی ہُوئی
اک نئے رشتہ کی سرخوشی میں کھلکھلاتی ہوئی، گنگناتی ہُوئی
بحر سے جا ملی!

اور پہاڑوں نے دیکھا
کہ اُن پر فقط برف کی دھجیاں رہ گئیں
اور محبت کا رشتہ نہایت کو پہنچا
کہ اس دہر کا کوئی رشتہ بھی ہو، بے نہایت نہیں

جب کہ روزِ ازل سے یہی کچھ ہوا ہے
تو ممکن ہے، اب کے بھی ایسا ہی ہو
دھوپ اپنی محبت کے رشتے کا پیچھا کرے
بحر سے برف کی سب نمی چوس لے
جگمگاتے ہُوئے شہروں پر اٹھا کر اسے
جب پہاڑوں کے نگروں سے گزرے
تو برف اس کی مٹھی سے گاؤں کی صورت نکلنے لگے
اور پہاڑوں کی قسمت بدلنے لگے

اک نہایت سے ایک اور رشتہ چلے
دھوپ سے ٹوٹ کر، برف کا جیسے پانی سے رشتہ چلا!

برف پانی میں زندہ ہے
اور دھوپ میں زندہ رہتا ہے پانی
یہ سب اپنی اپنی اکائی کے باوصف، اک دوسرے کی اکائی میں
زندہ ہیں

میں تجھ میں زندہ ہوں
تو مجھ میں زندہ ہے
یوں اک نہایت سے اک بے نہایت کی جانب سمٹتے ہوئے،
پھیل جاتے ہوئے دائروں کی الگ بات ہے
ورنہ اس دہر کا کوئی رشتہ بھی ہو بے نہایت نہیں

مارچ ۱۹۷۸ء

○

میں آپ اپنا جواب اور آپ اپنی نظیر
خود اپنے شہر میں تنہا، خود اپنے گھر میں فقیر

گماں جلوس کا ہوتا ہے جب بھی چلتا ہے
مرے جلو میں، مری حسرتوں کا جمِ غفیر

بکھر گیا ہوں کچھ اس طرح سطحِ عالم پر
کہ میری خاک ہی ہوتی ہے میری دامن گیر

تمام صحنِ چمن آگ کی لپیٹ میں ہے
کہ رنگِ گل بھی ہوا اس صدی میں آتش گیر

میں پھیل جاؤں گا چاروں طرف خلا کی طرح
ابھی وجود ہے میرا فصیلِ جاں میں اسیر

کسی سے زیر نہ ہو پائے فکر و فن کے دیار
کہ ملک فتح ہوئے پر ہوئے نہ دل تسخیر

میں لٹ تو جاؤں کہ لٹنا ہے مقدر رہونا
مگر یہ میرا اثاثہ! مگر یہ میرا ضمیر!

تمام زاویۂ ذہن کے کرشمے ہیں
کہ رُخ بدل کے جو دیکھا، بدل گئی تقدیر

کبھی تو پھول کھلیں گے ضمیرِ آدم میں
اگر یہ سچ ہے کہ مٹی ہے آدمی کا خمیر

فسادِ خلق کے ڈر سے ندیمؔ اپنی غزل
نہ پڑھ سکا تو وہ دیوار پر ہوئی تحریر

مارچ ۱۹۷۸ء

ایک انسان ملا
(منصورہ چشتی کی نذر)

سرِ شہراہِ حیات — اک عجب انسان ملا

اس کے ظاہر میں جو رعنائیاں تھیں
اس کے ذہن اور ضمیر اور محبت کی توانائیاں تھیں

اس کے باتوں میں جو سچائیاں تھیں
ایک سلجھے ہوئے ادراک کی دانائیاں تھیں

اس کے لہجے میں جو برنائیاں تھیں
ایک جاگے ہوئے وجدان کی انگڑائیاں تھیں

اس کی آنکھوں میں جو گہرائیاں تھیں
گو سمندر کی سی تا حدِ نظر پھیلی تنہائیاں لگتی تھیں ۔ مگر انجمن آرائیاں تھیں
جیسے اس شخص کی یزداں سے شناسائیاں تھیں

ایک انسان ملا یا کوئی عرفان ملا !
جیسے فطرت کی طرف سے مجھے کچھ اور بھی جاننے کا
ایک فرمان ملا !
سفرِ زیست کو ایقان سے طے کرتے چلے جانے کا
سر و سامان ملا !
سرِ شہراہِ حیات ـــــ اک عجب انسان ملا !

مارچ ۱۹۷۸ء

○

حسنِ اضداد سے بہلتا ہوں
برف کے منطقوں میں جلتا ہوں

میرے پہرے میں تیرگی کا حصار
چاند ہوں، رات کو نکلتا ہوں

کر لیا میں نے وقت کو پابند
وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں

کب مرا ذوقِ جستجو بدلا !
میں فقط راستہ بدلتا ہوں

کتنے محکم ہیں درد کے رشتے
شمع جلتی ہے، میں پگھلتا ہوں

قبر میں اپنا جسم بو کے ندیمؔ
تا ابد پھولتا ہوں پھلتا ہوں

اپریل ۱۹۷۸ء

○

نہ شکستہ حرف ہیں اجنبی، نہ دگرگوں لفظ پرائے ہیں
وہی غم ہیں میری متاعِ فن مرے تجربے میں جو آئے ہیں

گو سفر تو دھوپ نگر کا ہے یہ طلسمِ حسنِ نظر کا ہے
کہیں چھاؤں قربِ جمال کی، کہیں فیضِ عشق کے سائے ہیں

تری ایک جنبشِ چشم سے ہوئیں نغمہ نغمہ بصارتیں
ہوئیں غنچہ غنچہ سماعتیں، ذرا لب جو تو نے ہلائے ہیں

تو گیا تو بزمِ خیال سے ترے خدوخال کہاں گئے
مرے پھول کس نے جلائے ہیں، مرے چاند کس نے بجھائے ہیں

ترا انتظار نہیں رہا، ترا اعتبار نہیں رہا!
مرے اعتماد کی شاخ سے یہ طیور کس نے اُڑائے ہیں

مرے شوق پر یہ گرفت کیوں؟ اے خدا یہ نقشِ سرشت کیوں
یہ وہ نشہ ہے جسے آدمی ترے آسمان سے لائے ہیں

جو خلا کے جبر میں قید تھا، وہ خلا کے پار نکل گیا
جو گرا تھا بامِ بہشت سے، یہ حصار اسی نے گرائے ہیں

یہ غزل ندیم کی ہے مگر ترا لطف عام ہے کس قدر
کہ اسے یقین ہے سر بسر ترے شعر اس نے سنائے ہیں

اپریل ۱۹۷۸ء

O

درد کو جب دلِ شاعر میں زوال آتا ہے
جو بھی شعر آتا ہے، پتھر کی مثال آتا ہے

تیری آنکھوں میں کسی یاد کی لَو چمکی ہے
چاند نکلے تو سمندر پہ جمال آتا ہے

اِک نظر تو نے جو دیکھا تو صدی بیت گئی
مجھ کو بس اتنا حسابِ مہ و سال آتا ہے

بجلیاں جیسے چمکتے ہی کہیں کھو جائیں
اب کچھ اس طرح خیالِ خد و خال آتا ہے

اپنے ہی حسن سے ہیں لرزہ براندام طیور
جو بھی آتا ہے، اُٹھائے ہُوئے جال آتا ہے

آندھیاں میرے پرانوں کے تعاقب میں چلیں
یوں بھی بے وجہ، عناصر کو جلال آتا ہے

جب بھی تصویرِ بہاراں میں بھروں رنگِ نعیم
شاخ سے ٹوٹتے پتّوں کا خیال آتا ہے

اپریل ۱۹۷۸ء

○

فریاد کروں مگر کہاں تک
جب ساتھ نہ دے سکے زباں تک

آنسو تو میں پی رہا ہوں، لیکن
ممنوع کرو نہ ہچکیاں تک

گو نجا وہ سکوت پو پھٹے کا
مجھ کو نہ سنائی دی اذاں تک

انسان، خدا کی جستجو میں
بھٹکا ہے زمیں سے آسماں تک

پھیلا دیا ایک دامِ ابہام
پھولوں نے قفس سے آشیاں تک

اک اور فلک، پسِ فلک تھا
پہنچی ہے مری نظر جہاں تک

یہ ضبط نہیں ہے، خودکشی ہے
جب دل سے نہ اُٹھ سکے دھواں تک

زندہ ہیں ہُنر، ہُنروروں کے
قبروں کے تو مٹ گئے نشاں تک

مئی ۱۹۷۸ء

○

(نذرِ غالبؔ)

ہاتھ میں تیشہ ہے یا نسخہ کوئی اکسیر کا
کم نہیں ہوتا کھنڈر میں بھی جنوں تعمیر کا

چند جھنکاریں ہیں جن کی گونج ہے آفاق گیر
اور کیا سرمایہ ہوتا خانۂ زنجیر کا

دل سے لب تک حرف کا سارا سفر پُرخم میں ہے
شوق ہی گویائی کا، لیکن خوف ہے تکفیر کا

بھید یہ مجھ پر کھُلا اس شہرِ عزت مند میں
بے گناہی بھی ہے اک پہلو مری تقصیر کا

دوام
۱۹۴

درحقیقت دل میں گھر کرنا ہے پربت کاٹنا
تم نے افسانہ بنا ڈالا ہے جوئے شیر کا

خواب دیکھا تھا کہ ہم افسوں کی زد میں آئے تھے
عمر بھر پھر خواب دیکھا خواب کی تعبیر کا

شب تصور نے تری یادوں کی جب تجسیم کی
ایک جھونکے پر بھی دھوکا سا ہوا تصویر کا

ہجر سے موسوم کر لی اپنی کوتاہی ندیم
اور بھلا سا نام اس کو دے دیا تقدیر کا

مئی ۱۹۷۸ء

دوام
۱۹۵

یہ کیا گونج ہے؟

میں اس رات کی بے ازل و ابد خامشی میں
جو اک گونج سی سن رہا ہوں
یہ کیا گونج ہے؟
کائناتوں کے کس گوشۂ بے نہایت سے آئی ہے؟
اس کے تسلسل میں صرف ایک ہی لفظ کیوں گونجتا ہے؟
یہ اک لفظ کیا ہے جسے "کن" کے بعد اتنی عظمت ملی ہے؟
یہ لفظ اپنی تکمیل کی جستجو میں
کئی سورجوں کے مقدر پہ منڈلا رہا ہے

یہ کیا اسم ہے جو بھری کائناتوں کو بے اسم کرنے چلا ہے ؟
یہ کیا گونج ہے جو قیامت کے آثار سی ہے ؟
یہ چکی کے پاٹوں کے چلنے کی — سات آسمانوں کے اک دوسرے
کو کچلنے کی آواز کیا ہے ؟

خلاؤں کی بے انتہائی میں کچھ پس رہا ہے کہ کچھ بن رہا ہے ؟
یہ سب کچھ نہیں ہے تو کیا اَن گنت کائناتوں کا خالق خدا
اک نیا تجربہ کر رہا ہے ؟

جون ۱۹۷۸ء

○

ہر شے اپنی اپنی زباں میں اظہارِ حالات کرے
صبح کو چڑیا پیڑ پہ شب بسری کی بات کرے

انساں یوں تو نفس نفس میں طے بحرِ ظلمات کرے
عشق اگر بس جائے لہو میں، کارِ آبِ حیات کرے

کسی وجود، کسی جذبے سے پیار ہی ہے اثباتِ حیات
پیار نہ ہو تو اس دنیا میں کون گزر اوقات کرے

ایک محبت سے ڈر تھا، سو اس کو عالمگیر کیا
کون ہے اب جو بھرے جہاں میں ہم کو اسیرِ ذات کرے

ہم پیاسوں کی پیاس نہ دیکھو ہم تو دل کے سمندر ہیں
شب ظلمت میں عمر گزارے اور سحر سوغات کرے

گنگ ہوئیں حرفوں کی زبانیں سنگ ہوئے لفظوں کے لب
اب تو ہماری خاموشی ہی ترسیلِ جذبات کرے

موت کو اپنی نافہمی میں سمجھے جو قسمت کا نام ندیم
خاکِ لحد سے سبزہ پھوٹے اور اعلانِ ثبات کرے

جون ۱۹۷۸ء

○

رات کے ساتھ ہی رخصت ہوا مہتاب اپنا
اب کسے ڈھونڈتا ہے دیدۂ بے خواب اپنا

ہم وہ دریا، کہ تجھے پار لگانے کے لیے
توڑ بیٹھے ہیں بپھرتا ہوا گرداب اپنا

تہ بہ تہ تیرگیوں سے جو نمٹنا چاہا
جل گیا آگ میں اپنی دلِ شب تاب اپنا

ہائے یہ حسنِ نظر، وائے یہ رعنائیِ فن
ہم تو بھوکے ہیں مگر کھیت ہے شاداب اپنا

عمر بھر ہم نے بہایا اگر آنکھوں سے لہو
مطمئن ہیں کہ وطن تو ہُوا سیراب اپنا

ایک دنیا نے یہاں پیاس بجھائی ہے ندیمؔ
اس سخاوت میں سمندر رہُوا پایاب اپنا

جون ۱۹۷۸ء

معیارِ رہنمائی

اِک مشتِ زر سے عشق کا سودا نہ کیجیے
اِنسان کے وقار کو رسوا نہ کیجیے

جذبے کا خون، فطرتِ انساں کا خون ہے
ایسا جو جی بھی چاہے تو ایسا نہ کیجیے

سجدہ بھی کیجیے تو بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنی انا کے وزن کو ہلکا نہ کیجیے

آئینہ دیکھنا ہے تو منظر ہزار ہیں
صرف ایک اپنا عکس ہی دیکھا نہ کیجیے

جب تلک ہیں خرمنوں پہ ستارے رُکے ہُوئے
بادل سے بجلیوں کا تقاضا نہ کیجیے

صحراؤں کا گھٹاؤں سے رشتہ غلط سہی
لیکن سمندروں پہ تو برسا نہ کیجیے

انساں نے حرف و صوت کو معنی عطا کیے
مفہوم کائنات سے کھیلا نہ کیجیے

تہذیب کے لباس سے دھوکا نہ کھائیے
چوروں پہ اپنے ملک کا در وا نہ کیجیے

تلقین کر رہا ہے غریبوں کو شیخِ شہر
صبر کیجیے یہ کوئی تہمت نہ کیجیے

جولائی ۱۹۷۸ء

○

عالمِ ہجر میں سویا ہوں، نہ سونا چاہوں
میں تری ذات سے مایوس نہ ہونا چاہوں

گُل ترے دل میں کِھلیں، اور مہک جاؤں میں
اسی رشتے میں ہر انساں کو پرونا چاہوں

کیوں گوارا ہو ترے درد میں بھی شرکتِ غیر
تو جو یاد آئے تو تنہائی میں رونا چاہوں

جستجو کے لیے رہتا ہے بہانہ درکار
کھو کے پایا جسے، پا کر اسے کھونا چاہوں

چھا رہا ہے مرے اندر غمِ انجام کا ابر
خوش بھی ہوتا ہوں تو آنکھوں کو بھگونا چاہوں

ہیں ہوں اک طرفہ بھکاری کوئی میری بھی سنو
رات کے فرش پہ کرنوں کا بچھونا چاہوں

یوں تو اک پھول کی پتّی سے بہل جاتا ہوں
ہیں مچل جاؤں تو صحرا کا کھلونا چاہوں

میرا منصب نہیں پیغمبرِ فن بننے کا
ہیں تو احساس کو لفظوں میں سمونا چاہوں

اس زمانے کا عجب طرزِ تصوّف ہے ندیمؔ
کہ ہیں قطرے میں سمندر کو ڈبونا چاہوں

حواس

بصارت منجمد ہے
اور زباں اک برف پارے کی طرح سُن ہے
مرے بیج ڈالتے ہیں ریت کے ذرات اُڑتے ہیں
سماعت اس قدر بے دست و پا ہے
صرف سناٹے کی مبہم اور پیہم چیخ اس کی دسترس میں ہے
زمیں کو سونگھتا ہوں تو خلا کی باس آتی ہے
فقط اک حس ابھی زندہ ہے
مستقبل کے لمسِ دلربا کی حس!
مسلسل ارتقا کی حس!
خدا کی حس!

⊙

یہ جو اک عمر کی تنہائی ہے
میرا معیارِ توانائی ہے

ہر طرف ایک ہی صورت کا ہجوم
یہ عجب انجمن آرائی ہے

وہی اک چاند، وہی ایک زمیں
تیری میری یہی یکجائی ہے

شب کو جلتا ہے وہی مثلِ چراغ
دل کو جو لالۂ صحرائی ہے

عشق پتھر سے نمی مانگتا ہے
عقل کہتی ہے، یہ دانائی ہے

بول سکتے ہیں، مگر سب چپ ہیں
یہ بھی اک طرح کی گویائی ہے

نوکِ خنجر سے رسے زخمِ ندیم
یہ نیا طرزِ مسیحائی ہے

جولائی ۷۸ء

یاد

رات کے وقت، مرے دل پہ، تری یاد کا ہاتھ
اتنی نرمی سے اُترتا ہے کہ جیسے شبنم
اِک چٹکتی ہوئی نورستہ کلی پر اُترے

جولائی ۱۹۷۸ء

قریب آؤ تو دیکھوں

قریب آؤ تو دیکھوں
تم مرے معیار کی حد تک حسیں ہو
یا پھر اس معیار سے بھی ماورا ہو
جیسے انساں کے تصور میں خدا ہو!

جولائی ۱۹۷۸ء

بلاوا

بارشوں کے موسم میں
بوندیوں کی دستک نے
میرے گھر کے دروازے
مجھ پہ کھول ڈالے ہیں

جولائی ۱۹۷۸ء

○

روشنی کا، افقِ شب پہ اشارہ کیوں ہے؟
رات اُمڈی ہے مگر ساتھ ستارا کیوں ہے؟

وہ جو گرداب سے لرزاں ہیں، ذرا غور کریں
ہر بپھرتے ہوئے دریا کا کنارا کیوں ہے؟

برف پگھلی ہے تو کیوں اس میں ہے تلوار کی کاٹ
راکھ ٹھنڈی ہے تو پھر اس میں شرارہ کیوں ہے؟

زرِ محنت جو ہمارا ہے، وہ سب کا ہے اگر
قصرِ مرمر جو تمھارا ہے، تمھارا کیوں ہے؟

راہ گر کوئی نہ سُوجھی تھی تو ہم سے کہتا
رہنما نے ہمیں دوراہے پہ مارا کیوں ہے؟

یہ تصرّف ہے ترا، یا مرا معیارِ وفا
ترکِ اُلفت پہ بھی تُو اتنا ہی پیارا کیوں ہے؟

عشق اگر کچھ بھی نہیں جز ہوسِ جسم ندیم
اس نے الہام مرے دل میں اُتارا کیوں ہے؟

جولائی ۱۹۷۸ء

وائرے

زخم بھر جاتے ہیں
ذہنوں سے اُتر جاتے ہیں
دن گزرتا ہے تو پھر شب بھی گزر جاتی ہے
پھول جس شاخ سے جھڑ جاتے ہیں
مرجھاتے ہیں

چند ہی روز میں
اُس شاخ پہ آئندہ کے پھولوں کے نگینے سے اُبھر آتے ہیں
تیرے جانے سے مری ذات کے اندر جو خلا گونجتا ہے
اک نہ اک دن اسے بھر جانا ہے
اک نہ اک روز تجھے
میری پھیلی ہوئی، ترسی ہوئی باہوں میں پلٹ آنا ہے!

جولائی ۱۹۷۸ء

غوطہ

قدم گھر سے نکالوں
تو گلی، خندق کی صورت میں نظر آتی ہے!
جب چلتا ہوں
یوں محسوس ہوتا ہے
کہ میں اُترا چلا جاتا ہوں!
میرے شہر کو دھرتی کے ماتھے کا اُجالا کہنے والے
جھوٹ کب کہتے تھے

لیکن یہ گئے دن کی کہانی ہے
کہ جو بستی زمیں پر حسنِ تہذیب و تمدن کا نمونہ تھی
وہ اب تحت الثریٰ کی سرحدوں کے آس پاس
اک غار میں بکھری ہوئی محصور بیٹھی ہے
اسی باعث میں اپنے شہر کی گہرائیوں میں یوں اُترتا ہوں
کنوئیں میں جیسے بچہ گر پڑے تو غوطہ خور اترے!

جولائی ۱۹۷۸ء

○

عشق بے دم ہے تو فردوسِ وفا مت ڈھونڈو
ریت پھانکی ہے تو گندم کا مزا مت ڈھونڈو

سر سے پا تک ہوں جب اُتری ہُوئی سرسوں کی رُتیں
پھر کسی ہاتھ پہ نیرنگِ حنا مت ڈھونڈو

دھجیاں اپنی حمیت کی، چھپاؤ گے کہاں
سر سے نوچی ہُوئی، بیٹی کی ردا مت ڈھونڈو

جرم کے بوجھ سے دبتا ہے تو رو رتا ہے ضمیر
ہر طرف سے جو اُمڈتی ہے صدا، مت ڈھونڈو

حضرتِ خضر کو بھی زحمتِ خیر اِست نہ دو
تن کے جینا ہے تو پھر آبِ بقا مت ڈھونڈو

اپنے ایمان کو آوارہ نہ ہونے دو کبھی!
ایک ٹل جائے تو ایک اور خدا مت ڈھونڈو

اس سے پوچھو، سفرِ جنسِ شبی کیسے کٹا
دامنِ صبح میں گل ہائے صبا مت ڈھونڈو

افقِ حسن سے اک پل بھی نگاہیں نہ ہٹیں
عشق کرنا ہے تو کچھ اس کے سوا مت ڈھونڈو

تم جب انساں ہو، تو انساں کی جبلت میں نہ بہکو
خیر کے پھول چنو اور خطا مت ڈھونڈو

جولائی ۸ ۱۹۷ء

○

درِ کسریٰ پہ صدا کیا کرتا
اک کھنڈر مجھ کو عطا کیا کرتا

جس اندھیرے میں ستارے نہ جلے
ایک مٹی کا دیا کیا کرتا

ریت بھی ہاتھ میں جس کے نہ رُکی
وہ تہی دست، دعا کیا کرتا

ڈھب سے جینا بھی نہ آیا جس کو
اپنے مرنے کا گلہ کیا کرتا

اس کا ہونا ہے مرے ہونے سے
میں نہ ہوتا تو خدا کیا کرتا

تُو نے کب مجھ کو دیے میرے حقوق
میں ترا قرض ادا کیا کرتا

ایک دھتکار تو جھولی میں پڑی
تو نہ ہوتا تو گدا کیا کرتا

جو نہ سمجھا کبھی مفہومِ وفا
اپنا وعدہ بھی وفا کیا کرتا

تشنہ لب آئے مگر ڈوب گئے
چشمۂ آبِ بقا کیا کرتا

نکہت و رنگ کا پیاسا تھا ندیم
صرف اک لمسِ ہوا کیا کرتا

اگست ۱۹۷۸ء

○

دستِ تقدیر نے یوں نقش ابھارا میرا
میری پلکوں پہ اُتارا ہے ستارا میرا

پیار سے دست کشی کا نہیں یارا میرا
اس کا پیارا ہوں کہ جو شخص ہے پیارا میرا

وہ نہیں ہے تو سرِ دشتِ تمنا کس نے
اس کی آواز میں پھر نام پکارا میرا

راہیں، ہاتھوں کی لکیروں کی طرح روشن ہیں
اس کی یادیں، سفرِ شب میں سہارا میرا

میں تو سمجھا تھا کہ دن بھر کی رفاقت ہوگی
رات کے ساتھ گیا صبح کا تارا میرا

وہ سمندر ہوں جو ملاحوں سے شرمندہ ہے
اتنا گہرا ہوں کہ پاتال، کنارا میرا

تیر سینے میں جو اُترا تو لہو کیوں نہ بہا
امتحاں لینے چلے ہیں وہ دوبارہ میرا

میں کہ فن کار ہوں، کیوں داد نہ دیتا فن کی
دستِ قاتل نے اگر زخم سنوارا میرا

ستمبر ۱۹۷۸ء

ہم کو چاند اور تاروں سے بڑھ کر یہ منظر سہانے لگے
آنسوؤں سے ہو بھیگا ہُوا جس کا چہرہ، وہی مسکرانے لگے

رات بھر ہم نے تیرے کھُلے گیسوؤں میں بسی چاند صورت کو ڈھونڈا
صبح کو تیرے جاتے ہی ہر سُو، ترے خال و خد جگمگانے لگے

موسمِ گل جب آیا تو گلزار و صحرا کی ساری تمیز اُٹھ گئی
خشک شاخوں سے ٹُوٹے ہُوئے زرد پتّے، دفیں سی بجانے لگے

دن چھپا تو مسافر سحر کے لیے کتنی تاریک صدیوں سے گزرا
ایک سورج کے بعد ایک سورج نکلنے میں کتنے زمانے لگے

جانے ان بے زبانوں نے کیسی قیامت کے آثار افق پار دیکھے
شام سے قبل ہی اب پرندوں کے غول آشیانوں کو جانے لگے

جس نے جس دور میں بھی مسیحائی کی اُس کو مصلوب ہونا پڑا
لوگ مُردوں کو زندہ کرنے کے بعد اس کو مقتل میں لانے لگے

ستمبر ۱۹۷۸ء

بلیغ آنکھیں

میں جھانکتا ہوں جب اُس کی بلیغ آنکھوں میں
بصارتوں پہ صحیفے اترنے لگتے ہیں
مری نگاہ میں تحلیل ہو کے اس کے نقوش
لہو کی طرح رگوں سے گزرنے لگتے ہیں
بہت شدید ہے اُس لمحے کی گرفتِ جمال
کہ زخم بھی مرے دل میں سنورنے لگتے ہیں
سمندروں کی تہوں سے، پھڑا کے دامنِ چاک
صدی صدی کے سفینے اُبھرنے لگتے ہیں
چھلکنے لگتی ہیں خواب و خیال کی کلیاں
قریب و دور ستارے بکھرنے لگتے ہیں

اکتوبر ۱۹۷۸ء

○

ذرّے ذرّے میں جو تابانیِ جوہر دیکھیں
وہی، انساں کو فرشتے کا بھی ہمسر دیکھیں

یہ نہ دیکھیں کہ زمیں خود بھی ہے اک ستارہ
لوگ حسرت سے فلک پر مہ و اختر دیکھیں

یہ قلندر ہیں — مگر نام ہیں کیا رکھا ہے
آؤ، اِس دور کے دارا و سکندر دیکھیں

دھوپ سے جن کو گلہ ہے کہ جلا ڈالے گی
اپنے اندر کے اندھیروں سے نہ باہر دیکھیں

ذات کو کھوجنے والوں سے شکایت کیسی
خود کو جو ڈھونڈ نہ پائیں، ہمیں کیونکر دیکھیں

ہم تو وہ دشت نوردانِ محبت ہیں ندیمؔ
ایک ہی گل سے دو عالم کو معطر دیکھیں

نومبر ۸۷ء ۱۹

دُھند

گھر میں لپٹا سورج نکلا
دستِ فلک کے ہاتھ میں جیسے طشت پرانا!
چار طرف اشجار نہیں، اشجار کے سائے استادہ ہیں
شاخیں برگ و ثمر سے خالی
ہریالی بھی دھندلی دھندلی، کالی کالی!
پھول، سحر کے دھوکے میں انگڑائی لے کر پتّی پتّی بکھر گیا ہے!
چڑیا اپنے رین بسیرے سے نکلی ہے لیکن رستہ بھول گئی ہے!
سڑک پہ تانگے کے گھوڑے کی ٹاپیں کوسے چھوڑ رہی ہیں!
ایک غبار سے بہنچنے والا

بچّوں سے محروم گلی میں آ کر جیسے سوچ رہا ہے
رووں یا آواز لگاؤں!
چمنی سے جو دھوئیں کا اک مینار اُبھرا تھا
کہر میں جیسے گڈمڈ ہُوا ہے!
بچہ ماں سے ضد کرتا ہے — صبح کہاں ہے؟
صبحیں ایسی مٹیالی مٹیالی کیسے ہو سکتی ہیں!

اک سورج کے دُھندلے پن نے کتنے مسائل جنم دیئے ہیں!
جیسے قدرت کا آئین بدلنے لگا ہے!
وقت بھی جیسے پاؤں گھسٹ کر چلنے لگا ہے!
روشن چہروں پر بھی دھبّے پڑنے لگے ہیں!
پتّے پیار کے پیڑوں سے بھی جھڑنے لگے ہیں!

نومبر ۱۹۷۸ء

○

نہ جانے خال و خد کیوں چھن گئے ہیں خوش جمالوں کے
ہیولے سے نظر آتے ہیں صحرا میں غزالوں کے

اِک ایسے دَور میں تخلیقِ فن کی مجھ کو سوجھی ہے
اگر سوچوں تو پر کٹنے لگیں میرے خیالوں کے

زمیں کے در پہ دستک دوں تو شاید خاک بولی اُٹھے
جواب آتے نہیں افلاک سے، میرے سوالوں کے

یہ وقت ایسا ہے جب جذبے کا سکّہ چل نہیں سکتا
کہ دیوانے بھی طالب ہیں دلیلوں کے، حوالوں کے

مجھے نابود ہو جانے سے روکا اس حقیقت نے
زوالوں کے کھنڈر پر قصر اُٹھتے ہیں کمالوں کے

ندیمؔ اب اِک قصیدہ اس گروہِ حسن کاراں کا
فسانے تو بہت لکھے ہیں تو نے گاؤں والوں کے

نومبر ۱۹۷۸ء

متفرق اشعار

کوئی گلہ نہ کروں گا ترمی رضا کے بغیر
مگر لرزتے لبوں کو کہاں چھپاؤں گا میں
میں ہر کلی کی چٹک میں تجھے صدا دوں گا
کہ مل کے خاک میں بھی، بار بار آؤں گا میں

—

جس سے پوچھو، یہی کہتا ہے کہ میں زندہ ہوں
وقت کی قبر کا احساس کسی کو بھی نہیں

—

ناقد نے لغات کھول لی ہے
یوں قدر ہوئی مرے ہنر کی

بحر و صحرا ہوں کہ سیارے ہوں یا افلاک ہوں
ہر ورق پر ایک ہی اسلوب ہے تحریر کا

جانے کس کرب سے تپتی ہیں زمینیں اپنی
اب تو سجدوں میں بھی جلتی ہیں جبینیں اپنی